اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(نومبر ۲۰۰۹ء)

اِقبال رِویو

اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(نومبر ۲۰۰۹ء)

اقبال ریویو

جلد (۱۸) شمارہ (۲)

ISBN No: 81-86370-44-7

اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا

مجلس مشاورت

۱۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد
(صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)

۲۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور)

مجلس ادارت

۱۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر
(نائب صدر اکیڈیمی)

۲۔ سید امتیاز الدین
(معتمد اکیڈیمی و ایڈیٹر)

بدل اشتراک

فی شمارہ ۵۰ روپے
ایک سال کے لیے (دو شمارے) ۹۰ روپے
بیرونِ ملک: فی شمارہ ۵ ڈالر یا متبادل رقم

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :

اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل: 10-5-7/1 تالاب ماں صاحبہ ۔ حیدرآباد۔500028

آندھرا پردیش (انڈیا)۔فون:66663950

e-mail:ihfiqbal@hotmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد کلیم محی الدین، افضال الحق ندوی ''شارپ کمپیوٹر'' H.NO.16-8-907/A،

نیو ملک پیٹ، قریب ریلوے اسٹیشن، حیدرآباد 500024۔فون:9392427796

سید امتیاز الدین ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے وی جی پرنٹرز دلسکھ نگر حیدرآباد سے طبع کروا کر
اقبال اکیڈیمی حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

(اقبال ریویو۔نومبر ۲۰۰۹ء)

	اداریہ	ادارہ
۱	''بزمِ انجم'' اقبال کی ایک نظم کا تجزیاتی مطالعہ	محمد افضل ملک
۲	اقبال کی نوائے شوق	ڈاکٹر حامدی کاشمیری
۳	تصانیف اقبال کے تراجم: (ایک اجمالی تذکرہ)	جناب سید احمد ایثار
۴	اقبال کا ذوقِ علم و تحقیق	پروفیسر رفیع الدین ہاشمی
۵	اقبال کا تصورِ جہاد	پروفیسر عبدالحق
۶	جگن ناتھ آزاد کی نعتیہ شاعری۔فکر اقبال کے آئینہ میں	ڈاکٹر طارق احمد مسعودی
۷	میرا فن اور شاعر مشرق	عبدالرحمٰن چغتائی
۸	چغتائی کا آرٹ	ڈاکٹر جیمز کزنز
۹	دیباچۂ مرقعِ چغتائی	علامہ اقبال
۱۰	خبرنامہ	ادارہ
11	" Baaqiat-e- Eqbal New Tasks for Iqbal Academy	Hameeduddin Mahmood

☆☆☆

اداریہ

یوں تو اقبال ریویو کی میعاد اشاعت ۶ ماہ کی ہے۔ لیکن ہر چھ ماہ میں ریویو کی اشاعت بھی ہمیں دشوار معلوم ہوتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ معیاری مضامین کا حصول ہے۔ اس لئے ہمیں قدیم اور معیاری رسائل سے بھی اہم مضامین کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تک ماخوذات کا تعلق ہے ہمارے بعض مخلصین نے توجہ دلائی تھی کہ صرف نئے مضامین شائع کئے جائیں۔ لیکن محدود ہی سہی جو لوگ اقبالیات کا مطالعہ کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ نئے اور معیاری مضامین کا حصول بوجوہ کتنا دشوار ہے۔ لیکن ادارہ کی جانب سے قدیم اور یادگار رسائل سے جو مضامین اخذ کئے جاتے ہیں ان کی اپنے معیار اور مقالہ نگاروں کی علمی منزلت کے اعتبار سے اہمیت اور وقعت رکھتے ہیں۔ ویسے یہ مضامین بھی اکثر اہل نظر کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ اس لئے ان کی دوبارہ اشاعت اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔

حال ہی میں حیدرآباد سے اردو اکیڈیمی کی جانب سے ممتاز اور معروف فن کار جناب عبدالرحمان چغتائی کا مصور مرقع غالب شائع کیا گیا ہے۔ اس موقع کی مناسبت سے اس مرقع کے بارے میں چند اہم مضامین کا انتخاب پیش کر رہے ہیں۔ ایک تو خود علامہ اقبال کا دیباچہ ہے جس کا ترجمہ پروفیسر غلام دستگیر رشید نے کیا تھا اور جو جناب تصدق حسین تاج کی مرتبہ مضامین اقبال (مطبوعہ ۱۳۶۲ھ) میں شامل ہے۔ اس مختصر لیکن جامع تحریر میں اقبال کے تصورفن کے بارے میں اساسی اشارات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

دوسرا مضمون جریدہ کاروان لاہور ۱۹۳۴ء میں ''چغتائی کا آرٹ'' کے عنوان سے ڈاکٹر جیمز کزنز کا ترجمہ رشیدہ ذکاء اللہ نے کیا تھا۔ اس کے علاوہ چغتائی نے اپنے ایک مضمون میں ''میرا فن اور شاعر مشرق'' میں فاضل فنکار نے اقبال سے اپنی ملاقاتوں اور ان سے استفادہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ مضامین بھی شائع کئے جارہے ہیں۔ اسی طرح اقبال کے فنی محاسن کے تجزیہ کے ضمن میں اقبال کی نظم ''بزم انجم'' کا تجزیہ محمد افضل ملک نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ مشہور نقاد ڈاکٹر حامدی کاشمیری کا مضمون ''اقبال کی نوائے شوق'' کافی دلچسپ ہے جس میں انہوں نے اس خیال کو پیش کیا ہے کہ

اقبال کی آتش نوائی میں بے شک خارجی محرکات کام کرتے ہیں۔ لیکن ان کے بنیادی محرک کا سراغ تو کہیں اور نہیں صرف ان کے باطن میں لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا اہم نکتہ ہے جو اکثر ناقدانِ اقبال کی نظروں سے اوجھل رہ جاتا ہے۔

ان ماخوذ مضامین کے علاوہ نئے مضامین میں پروفیسر عبدالحق (سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی) کا مضمون ''اقبال کا تصور جہاد'' اور ڈاکٹر طارق مسعودی کا مضمون ''جگن ناتھ آزاد کی نعتیہ شاعری فکر اقبال کے آئینہ میں'' اس شمارہ کی زینت ہیں۔ بنگلور کے جناب سید احمد ایثار نے اقبال کی جملہ فارسی کتابوں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ انہوں نے تصانیف اقبال کے اردو تراجم کا جائزہ اپنے مضمون میں پیش کیا ہے۔ یہ مضمون بڑا معلوماتی ہے جس سے کلام اقبال کے تراجم اور ان کے مراجع کا اندازہ ہوتا ہے۔

اقبالیات کے مشہور نقاد پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کا وقیع مضمون ''اقبال کا ذوقِ علم و تحقیق'' ایک اہم مضمون ہے۔

جناب حمید الدین محمود ایک نہایت ذہین اسکالر تھے اور انگریزی کے نامور صحافی تھے جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین! ان کی ذہانت اور جرأت اظہار کے تمام احباب معترف تھے۔ اقبال اکیڈمی کی مساعی کو ایک نئی جہت دینے کیلئے بعض تجاویز پر موصوف سے گفتگو ہوئی تھی۔ انہوں نے ہماری درخواست کو قبول کرتے ہوئے فوری اپنی تجاویز کو تحریراً روانہ کیا تھا۔ یہ تجاویز اقبالیات کی پذیرائی اور ان کو مقبول عام بنانے میں بڑی مفید اور کارآمد ہیں۔ لیکن ان تمام تجاویز پر عمل اقبال اکیڈمی جیسے ایک ادارہ کیلئے ممکن نہیں ہے۔ لیکن حمید الدین محمود کی تجاویز پر مشتمل ان کا مضمون اقبالیات پر کام کرنے والے اسکالرس اور اداروں کے استفادہ کیلئے پیش کیا جارہا۔

ریویو کے آخری حصہ میں خبرنامہ، حسب معمول شامل ہے۔ اس دوران سب سے اہم واقعہ ہمارے محسن ڈاکٹر سید عبدالمنان کا انتقال پُر ملال ہے۔ اللہ پاک انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

ادارہ

☆☆☆

محمد افضل ملک

''بزم انجم'' (بانگِ درا)

(اقبال کی ایک نظم کا تجزیہ)

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو
طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے
وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے
کہتا ہے جن کو انسان اپنی زباں میں ''تارے''

محوِ فلک فروزی تھی انجمن فلک کی
عرشِ بریں سے آئی آواز اک ملک کی

اے شب کے پاسبانو! اے آسماں کے تارو
تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمہاری
چھیڑو سرور ایسا جاگ اٹھیں سونے والے
رہبر ہے قافلوں کی تابِ جبیں تمہاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں
شاید سنیں صدائیں اہل زمیں تمہاری
رخصت ہوئی خموشی تاروں بھری فضا سے
وسعت تھی آسماں کی معمور اس نوا سے
حسن ازل سے پیدا تاروں کی دلبری میں
جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں
آئینِ نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم
داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے
جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں (اقبال)

یہ نظم اپنے اندر مظاہر فطرت یا کائنات کی بزرگ و برتر قوتوں کا ایک ڈرامہ سمیٹے ہوئے ہے جس کے کردار سورج، شام، تارے، انسان وغیرہ ہیں، آفاق اس تمثیل کی اسٹیج ہے اور ملائک اس کے ناظرین ہیں۔ عرش کی یہ مخلوق حسنِ ازل کی جانب سے گویا سامعی کرنے Prompting کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ پھر انسان کو اس تمثیل میں شریک ہونے کی دعوت ملتی ہے اور وہ ناظر اور کردار دونوں روپ میں ابھرتا ہے تاکہ وہ اس شعور سے بہرہ ور ہو سکے کہ اصل زندگی صرف اسی صورت انسان کا مقدر بنتی ہے جب وہ المیہ کے ہیرو کی مانند آفاقی قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہو جائے۔ ''بزم انجم'' کے تمثیلی حصے کا کینوس نہایت وسیع ہے، اس تمثیل کا تعلق ہمارے Clock-time سے کہیں زیادہ Geological-time سے ہے۔ اس سطح پر تمثیل کا عرصہ قدروں کے ایک نظام کی شکست وریخت سے قدروں کے نئے نظام کی تکوین تک کا ہے۔ اولاً اس میں انسان کو دعوتِ نظارہ اس لئے دی جا رہی ہے کہ وہ بھی ارضی وقت سے ماوراء ہونے کی سکت پیدا کرے اور لازماں ہو کر اس کائناتی تمثیل کا ایک حصہ بن جائے۔

ثانیاً کائنات اور انسان کی ہم آہنگی یا وحدت معرضِ وجود میں آسکے اور اس طرح انسان، مافوق لانسان کی سطح پر آ کر حقیقت ازلی سے متعارف ہو سکے، یوں بھی زندگی محض Clock-time کی تنگنائے میں مقید نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ یہ شعری تمثیل انسان کو قوتِ حیات پر ایمان لانے کے لئے دعوتِ عمل پر ابھارتی ہے۔ اس مختصر سی نظم میں المیہ تمثیل کے مماثل کئی پہلو اجاگر ہوئے ہیں۔ المیہ قادرِ مطلق کے خلاف شکایت کا روپ پیش کرتا ہے۔ جب کہ یہاں رات کی ظلمتوں کے خلاف صف آراء ہونے کا مشورہ دیا گیا ہے جو انسان کی طرف سے عزم و عمل کی مکمل آزادی کی خواہش کا شاعرانہ اظہار ہے۔

جس طرح المیہ تمثیل انسان کو وحدت کا تصور عطا کرتی ہے بالکل اسی طرح اس نظم میں بھی فطرت اور عام انسان کی ہم آہنگی نیز باہمی محبت اور ہمدردی کے مسلک کو اہمیت ملی ہے۔ نظم کے مقطع میں ''جذب باہمی'' کی ترکیب وحدت کے اسی مسلک کی طرف ایک اشارہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ المیہ کی طرح تقدیر کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کی ایک درپردہ تڑپ بھی اس نظم میں موجود ہے۔

''بزم انجم'' کا تمثیلی حصہ اپنے اندر غنائیہ ہیئت Symphonic form لئے ہوئے

ہے اور یہ قاری میں بے پناہ تعمیری احساس اجاگر کرتا ہے۔ زندگی کے تجربے کا قائم مقام لفظ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نظم میں الفاظ فاعلی حیثیت سے کام کررہے ہیں، اس میں ہر لفظ مشیئت Thingness سے متصف ہے۔ ہر شئے جاندار نظر آتی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اقبالؒ کا رویہ اس نظم میں Animistic ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ میں جان موجود ہے۔

''بزمِ انجم'' میں انسان کی فطری قوتوں سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت کو بیدار کیا گیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اقبالؒ گرد و پیش کی اشیاء سے قوتِ حیات کو خوب جذب کرنا جانتے ہیں۔ اس اسلوبِ فکر کو فلسفہ کی زبان میں معروضی تصوریت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس میں تصوریت، زندگی سے الگ تجریدی حیثیت کی حامل نہیں ہوتی بلکہ قوتِ حیات کے دوائر اور امکانات کو وسیع تر کرتی ہے۔ اس معروضی تصوریت کی اساس پر انسان ایک ابدی تحریک اور دائمی فعلیت کی حالتوں سے گذرتا چلا جاتا ہے۔

معروضی تصوریت میں معروض اور موضوع حقیقتِ مطلق کے دو رخ ہیں۔ مادہ اور روح الگ الگ نہیں۔ حقیقت کے اس معروضی تصور کا ادراک کرنے سے انسان اور عالم امکان میں ایک عملی رشتہ قائم ہوجاتا ہے اور انسان زندگی کی حرکت اور نئے نئے خارجی حالات سے موافقت پیدا کرنے کی صلاحیت اپنی داخلی ہستی میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ یوں وہ کائنات کی اصلی حقیقت تک رسائی حاصل کرتا ہے اور فطرت کے عمل تغیر یا انقلاب کی لذت سے آشنا ہوجاتا ہے۔ چونکہ کائنات ابھی تک ناتمام ہے اور صدائے کن فیکون ہر لحظہ بلند ہو رہی ہے گویا عمل تخلیق جاری ہے جس میں انسان شریک ہے اس لئے ''بزمِ انجم'' میں اس عملِ تخلیق کے لئے انسان کو آفاقی سطح پر بلند ہونے کے لئے بیدار کیا جارہا ہے۔

محو فلک فروزی تھی انجمن فلک کی — عرش بریں سے آئی آواز اک ملک کی
چھیڑو سرود ایسا جاگ اٹھیں سونے والے — رہبر ہے قافلوں کی تابِ جبیں تمہاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں — شاید سنیں صدائیں اہل زمیں تمہاری

فطرت اور انسان کی ہم آہنگی سے اقبال حقیقت کا ادراک اور حسن ازل کی کرشمہ زائیوں سے لطف اندوزی کی تحریک دیتے ہیں۔

نظم کے تصویری پیکر اور استعارے مثلاً غروبِ آفتاب، شام سیہ قبا، طشتِ افق، لالے

کے پھول، سونے کے زیور، چاندی کے گہنے، مخمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت کا آنا، عروسِ شب کے موتی وغیرہ یہ سب کچھ مصوری کے نمونے ہیں جو شاعری کا ملبوس پہن کر سامنے آگئے ہیں۔ ''سورج کا جانا'' گویا زندگی کی روشن قدروں کے ایک نظام کا انحطاط پذیر ہونا ہے، چنانچہ اس رعایت سے ''شامِ سیہ قبا'' کا صوری پیکر شر کی قوت اور نراج کی ظلمت کا اظہار ہے ''طشتِ افق'' میں شاعری کی چشم بینا نے بیکراں افق کو سمیٹ لیا ہے۔ اس کی تب وتاب میں رنگوں کی گھلاوٹ دیدنی ہے۔ ''لالے کے پھول مارے'' کی تصویر میں کمال مصوری پنہاں ہے، رنگوں کے اس حسین وجمیل تناظر میں بے پناہ فعالیت موجود ہے۔ رنگوں کی شام سیہ قبا کی تاریکی سے ہاتھاپائی اور پھر اس ظلمت پر غالب آنے کا عمل جاندار اور حقیقی ہے۔ اقبال کی اس نظم میں شام سیہ قبا کی تمثیل اس اعتبار سے بھی دلچسپ ہے کہ اس میں شادی کا منظر نگاہوں کے سامنے ابھرآتا ہے۔ مثلاً طشت سے لالے کے پھول لے کر ''شام سیہ قبا'' کو مارنے کے عمل میں شادی بیاہ کی بعض رسموں کی طرف قاری کا ذہن باآسانی منتقل ہوجاتا ہے۔ پھر چاندی کے گہنے اور سادہ لباس اتار کر سونے کے گہنے اور بھڑکیلا لباس پہنانے کی بات بھی ایک عام سادہ لڑکی کو دلہن بنانے کے عمل ہی کی طرف ایک اشارہ ہے۔ نظم کے ابتدائی اشعار میں ''مخمل'' اور ''عروس'' کے الفاظ اس ہنگامۂ شادی کی تصویر کو مکمل کردیتے ہیں۔ گویا اقبال نے انتہائی فن کارانہ انداز میں کائنات کے تخلیقی عمل کو ارضی سطح کے تخلیقی عمل اور اس کے سارے پس منظر سے (جو شادی بیاہ کی رسوم پر مشتمل ہے) مربوط کردیا ہے۔

تمثیلی حصے کی ابتدا سے ہی یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے کہ کائنات کا تخلیقی عمل ہنوز تشنۂ تکمیل ہے بلکہ حسن ازلی نئی نئی صورتوں میں پیہم جلوہ گر ہو رہا ہے اور کائنات میں صدائے کن فیکون برابر بلند ہو رہی ہے۔ نظم میں ''شب کے پاسبانو'' کو یہ مژدہ دیا جارہا ہے کہ وہ تمثیل کے دوسرے کرداروں یعنی ''اہل زمین'' کو بیدار کریں، اس مژدہ کے لئے لفظ ''سرود'' استعمال کیا گیا ہے کہ خوابیدہ انسان میں وہ قوتِ حیات بیدار ہوجائے جو اسے معروضی سطح سے بلند کرکے ازلی دورِ حیات سے بہرہ ور کرسکے۔ اور وہ اس برادری میں شامل ہوجائے جس میں ستارے بھی شریک ہیں۔

آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم
داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں

نظم کا یہ حصہ بے حد فعال اور تعمیری احساس سے معمور ہے۔ اس مژدہ سے تمام عالم ایک بارگی گونج اٹھتا ہے، اس پس پردہ موسیقی سے جو ڈرامائی تحریک پیدا ہوی ہے وہ خوابیدہ نوع انسانی میں نظام نو تخلیق کرنے کی قوت سے لبریز ہے۔ اس میں 'کن فیکون' کی بازگشت اور آواز کے زمانی و مکانی عمل ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور یہی اس نظم کا اہم ترین پہلو ہے۔

(ماخوذ از۔ اوراق لاہور، نومبر۔ دسمبر ۱۹۴۷ء شمارہ خاص ۔زیر ادارت۔ وزیر آغا و عارف عبدالمتین ۔مقام اشاعت۔ دفتر اوراق، چوک بازار، لاہور)

☆☆☆

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

اقبال کی نوائے شوق

''بال جبریل'' کی پہلی غزل کا پہلا مصرع ہے۔

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں

یہ نوائے شوق کیا ہے؟ کیا اسے ''بال جبریل'' کے حوالے سے اقبال کی ایک نئی تخلیق جست سے منسوب کیا جاسکتا ہے؟ اس نوائے شوق کی اصل، ماہیت اور انفرادیت کی نشان دہی کیوں کر ہوسکتی ہے؟

یہ مسلم ہے کہ اقبال حرکت کے شاعر ہیں، ان کی حرکت کے فلسفے کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، اور ان کے کلام سے وافر مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ اس ضمن میں ان کے ''شوق'' (جسے وہ عشق بھی کہتے ہیں) کی اصطلاح کی متعدد تعبیریں بھی کی گئی ہیں۔ مجموعی طور پر ان کے یہاں ''شوق'' کو ان کی مقصدیت یا نصب العینیت کے ستارے کے طور پر سمجھا گیا ہے۔ ان کی مقصدیت کیا ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ موجودہ مادی اور کاروباری دور میں جب کہ انسان صدیوں کی ذی احترام قدروں سے بے گانہ ہورہا ہے، انسان اخلاقی صلاح یابی (Moral Regeneration)، ذہنی آزادی، آبرومندی اور روحانی سکون کے ساتھ زندگی گذار سکے۔ اقبال کے نزدیک یہ جب ہی ممکن ہے جب انسان خودشناسی کے عمل سے گذرے تاکہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے انفرادی اور اجتماعی طور پر ایک متوازن اور بابرکت زندگی گذارے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ انسان کے لے متحرک ہونا لازمی سمجھتے ہیں، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان کے دل میں آتش شوق روشن نہ ہو۔

''شوق'' کی اس مقصدی تعبیر وتشریح سے کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ اس کے زوال کے جو بھی خارجی، سیاسی اور سماجی محرکات پیش کیے گئے ہیں، یعنی انسان کی مادہ پرستی، اس

کی روحانی اوصاف سے بے گانگی، اسلامی اقدار سے روگردانی اور انسانی منصب کی بے توقیری، یہ سب اپنی جگہ پر درست سہی، تاہم ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''زوالِ آدم خاکی'' کی موجودہ عبرت ناک صورت حال کی ترڈدانگیز اور آفاق گیر آگہی اقبال ہی کے حصے میں کیوں کر آئی؟ اور وہ تن تنہا پوری سنجیدگی سے پورے عہد سے نبرد آزما ہونے پر تیار کیوں کر ہوئے؟

اس سوال کا جواب محض یہ کہہ کر نہیں دیا جا سکتا کہ اقبال اس عہد کے واحد ''دیدہ ور'' اور ''دردمند'' بڑے شاعر ہیں۔ یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ وہ تاریخ کے نکتہ سنج طالب علم رہے ہیں، شوکت پاستان سے ان کی دلی وابستگی رہی ہے، انسان دوستی ان کا مسلک رہا ہے، یا اپنے ہم وطنوں کی محکومی سے وہ متردد رہے ہیں۔ بے شک ان کو ایک غیر معمولی صورت حال سے گذرنا پڑا تھا، لیکن یہ صورت حال چالیس کروڑ ہندوستانیوں میں مشترک تھی۔ بجا کہ ہر ہندوستانی ان کی طرح بابصیرت نہ تھا کہ اس صورت حال کے مضمرات کو تمام وکمال سمجھ لیتا، لیکن حالت تو بہر حال سب پر ایک ہی سی مستولی تھی۔ انہوں نے ''تشکیل جدید'' میں خود لکھا ہے کہ ''وہ (انسان) اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے''۔ اس طرح ہمارا سامنا ایک ایسے مفکر شاعر سے ہوتا ہے جو معاصر بحرانی عہد کے پورے آشوب کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ وہ استحصالی اور غاصب قوتوں کو زیر کرنے کی تلقین کرتا ہے، وہ اس پر بس نہیں کرتا، بلکہ ''خلاقِ جہانِ تازہ'' ہونے پر اصرار کرتا ہے۔

خیزو خلاقِ جہانِ تازہ شو
شعلہ در بر کن، خلیل آوازہ شو

یہ وہ کام ہے جو کوئی دوسرا نہ کرسکا۔ ان کی ''آتش نوائی'' میں بے شک بعض خارجی محرکات کام کرتے ہیں۔ لیکن ان کے بنیادی محرک کا سراغ تو اور کہیں نہیں صرف ان کے باطن ہی میں لگایا جا سکتا ہے۔

پھونک ڈالا ہے میری آتش نوائی نے مجھے
اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

اقبال کی بیشتر شاعری ان کی باطن شناسی ہی کے عمل کی مظہر ہے، ان کے پورے فلسفۂ خودی کا محور یہی باطن شناسی ہے۔ باطن شناسی کی یہ ترغیب اتنا بیّن اور پُر زور عمل ہے کہ ان کی

شاعری ان کے باطن کا شناخت نامہ بن جاتی ہے۔ اس طرح اس عصری شعور کو مفرق کرنا ممکن ہوگیا ہے، جو اقبال کے معاصرین مثلاً جوش کے یہاں ملتا ہے۔ جوش اپنے عصری شعور کو بروے کار لاکر بلند آہنگی کے ساتھ سیاسی مسائل، مثلاً کشمکش حصولِ آزادی کی نغمہ خوانی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اس طرح ان کا عصری شعور محض ایک ذہنی عمل ہو کے رہ جاتا ہے، جب کہ اقبال کے یہاں عصری شعور شخصیت کی کلیت میں حل ہوکر ایک آفاقی شعور میں ڈھل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عصر کو 'دانندۂ اسرار' قرار نہیں دیتے ہیں۔ وہ تاریکی عصر کی حد بندیوں کو توڑ کر عالمی صورت حال پر محیط ہو جاتے ہیں۔

یہ معجزاتی عمل اقبال کے لیے یوں ممکن ہوا کہ وہ اپنے وسیع تر فکری تناظر کے بل بوتے پر اس کائناتی شعور پر حاوی ہو گئے' جس پر متصرف ہونے کے لئے سائنس، فلسفہ اور تصوف کوشاں رہے ہیں، تاہم جو اپنی کلی صورت میں کسی نابغۂ روزگار شاعر ہی کے حصے میں آتا ہے۔ یہ آگہی جتنی شعوری ہے اس سے کہیں زیادہ لاشعوری ہے۔ اقبال نے یورپ میں فکر و فلسفہ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ اور پھر بیسیوں صدی کے آغاز میں جب کہ جنگ عظیم کے گہرے سائے منڈلا رہے تھے، انہوں نے مغربی سیاست، تجارت اور استحصال، ملک گیری اور نوآبادیاتی جبر کے ہوش رُبا مناظر دیکھے۔ طبعاً وہ مفکر تھے، ان کی شعری سرشت بھی رفتہ رفتہ ان کے تفکر میں رچ بس گئی۔ وہ مشرق اور مغرب کے حوالے سے انسانی آشوب کا جائزہ لیتے رہے۔ ان کی خوش اقبالی یہ ہے کہ وہ محض علم و خبر یا اخذ و اکتساب پر قانع نہ رہے، بلکہ کارزارِ خیر و شر میں انسان کے منصب اور کارگذاری کو وہ خود پر وجدانی طور پر منکشف اور متعین کرنے میں کامیاب ہوئے۔

یہ خارج سے باطن کی طرف مراجعت کا رویہ ہے، یہ اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی پانے کا راستہ ہے، یہ خودی کے اسرار کی پردہ کشائی کا عمل ہے۔ چناں چہ ان کا مفکرانہ، متجسسانہ اور مستفسرانہ رویہ ان کو کائنات، خالق کائنات اور انسان کے مابین رشتوں کی آگہی کے قریب لے گیا، اور اس پیچیدہ صورت حال میں انسان کے لائحہ عمل کی تشکیلیت کے شعور سے متصف کر گیا۔ یہ محض در دملت یا درد انسان کا ورد کرنے سے ممکن نہ تھا۔ درِ ملت یا درِ انسان، یہاں تک کہ انقلابیت، کو حرز جاں بنانے والوں کی ہمارے یہاں ان دنوں کوئی کمی نہ تھی، لیکن ان میں سے کوئی اقبال کی سطح پر نہ آسکا۔ اقبال نے تخلیقی فن کی جس قوت کے ساتھ پوری صورت حال کا سامنا

کیا، وہ انہیں کا حصہ تھا۔ ان ہی نے انسان کو مابعد الطبیعیاتی سطح پر کائناتی پس منظر میں اپنے مقام و منصب سے آگاہ ہونے پر زور دیا، اتنا ہی نہیں بلکہ معاشرتی سطح پر اسے محکومی اور پسماندگی کے دلدل سے نکلنے کے لئے جو راہ نجات دکھائی وہ ان ہی سے ممکن تھی۔

اقبال نے دراصل حیات و کائنات کی اصل پر غور و فکر کرتے ہوئے بعض ازلی حقیقتوں تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ انہوں نے جیسا کہ ان کے خطبات سے ظاہر ہے، کائنات کی آفرینش کا راز دریافت کرنے کی سعی کی اور اس سلسلے میں سائنس، مغربی اور مسلم مفکرین اور متصوفانہ روایت نے جو پیش رفت کی ہے، اس پر بھی نظر رکھی۔ انسان کی تخصیص یہ ہے کہ وہ آگہی کی منزل پر کائناتی اسرار کو بے نقاب کرنے کی اس ازلی خواہش سے دوچار ہے جسے اقبال ''شوق'' کہتے ہیں۔ انسان کا دماغ ٹھوس مادی اصل کے باوجود اپنی ساخت اور خارج سے ٹکرانے کے ردعمل کے نتیجے میں غیر معمولی آگہی کو خلق کرنے پر قادر ہے۔ یہ ذہنی آگہی اپنی شدید صورت میں آگئی کی آگہی میں بدل جاتی ہے۔ یہ ذہنی عمل خارجی کائنات کے حقائق و مظاہر پر غور و فکر کرنے کی ترغیب دینے کے ساتھ ساتھ وجود کے توسط سے عرفان ذات یعنی know thyself کی طرف بھی لے جاتی ہے۔ یہ ذہنی عمل فنکار کے یہاں تخلیقی توانائی کی شناخت اور اس کی اظہار طلبی کے رموز سے آگہی کے مترادف ہو جاتا ہے۔ فن کار کائناتی اسرار کے اکتشاف کے لئے اپنے وجود سے رابطہ قائم کرتا ہے، اس لئے کہ اس کا وجود بھی کائنات کا ہی ایک ناگزیر حصہ ہے۔ وہ خود کو خود پر منکشف کرنے کے بے پناہ جذبے سے دوچار ہوتا ہے۔ خود اس کی کائنات بھی اکتشاف طلبی کے عمل سے گذرتی ہے، اس طرح سے عرفانیت کی معروضی بنیاد فراہم ہوتی ہے۔

کائنات کے بعض حقائق مثلاً زمان و مکان کے بارے میں سائنس، فلسفہ اور دیگر علوم نے اپنی اپنی توجیہات و تفاسیر پیش کی ہیں۔ جدید سائنس نے ایک قدم آگے بڑھ کر زماں کو ایک ابدی بہاؤ کی صورت میں دیکھا ہے، تاہم اس کا سہرا صرف سائنس کے سر نہیں جاتا، بلکہ مغربی اور مسلم فلسفیوں نے بھی اس سلسلے میں خاصا کام کیا ہے۔ سائنس مرورِ زماں کے نظریے پر زور دینے کے باوجود زماں کے معرض وجود میں آنے، اس کے مقصد اور آغاز و انجام اور اس کے خالق کے بارے میں کچھ نہیں کہتی۔ یہی صورت دیگر علمی و فکری شعبوں کی بھی ہے۔ مذہب کا تاہم یہ استدلال کہ اس عظیم کائناتی وقوعے کو محض اتفاق یا حادثہ پر محمول نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کے پس

پردہ کسی عظیم ترین منتظم کا دست غیب کام کرتا ہے، نا قابل تردید ہے۔

اقبالیاتی فکر کے ضمن میں بنیادی اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ کائنات یا اس کے مظاہر یعنی زماں و مکاں دراصل ایک لامتناہی تحریک پذیر اور عدیم النظیر انرجی کا اظہار ہے، جو مسلسل حرکیت سے قابل شناخت ہوتی ہے۔ یہ حرکیت مختلف مظاہر و موجودات کی طرح امکانی صورت میں انسان سے بھی مخصوص ہے۔ انسان بے کراں کائنات میں زمین جیسے معمولی سیارے پر سانس لینے کے باوجود اپنی فطری خصوصیت کی بنا پر کائنات سے اپنے رشتے کی اسراری نوعیت کو بے نقاب کرنے کا بے پناہ جذبہ رکھتا ہے۔ انسان کا یہ جذبہ اس توانائی کا پیدا کردہ، جو کائنات کا ایک حصہ ہونے کی بنا پر انسان کو ودیعت ہے۔ کائنات کے مقابلے میں اس کی تخصیص یہ ہے کہ کائنات کا حصہ ہونے کے باوجود اپنے وجود کی آگہی کی بنا پر اشرف المخلوقات کا درجہ رکھتا ہے۔ اس طرح سے اس کے وجود کی انفرادیت اور وقعت قائم ہو جاتی ہے۔ یہ شعور انا ہے، جو کائنات کا خاصہ ہے اور انسان میں مرتکز ہو کر اپنی آزاد تخلیقی حیثیت منواتا ہے۔ یہ وہی بے پایاں قوت ہے، جو کائنات کی شناخت ہے اور برابر توسیع پذیر ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

لازماً انسان کی قوت بھی بڑھتی ہے اور اپنا اظہار چاہتی ہے۔

اقبال کے حرکی تصور کا ایک پہلو یہ ہے کہ انسان کی تخلیقی قوتِ آزاد فطری ہونے کے باوصف فطرت کے مقابلے میں خود قائم کردہ تہذیب اور تطہیر کے قواعد کا احترام کرتی ہے، اور فطرت کے بے محابا قاہرانہ اظہار سے اپنے آپ کو ممیتز کرتی ہے۔ اقبال نے اپنی تخلیق قوت کے منبع تک رسائی حاصل کی اور پھر انسانی اقدار، تاریخ اور تمدن کے پس منظر میں اس کی ضروری تشکیل کی۔

اقبال کی یہی تخلیقی توانائی شاعری کے حوالے سے ''درد و سوز و آرزومندی'' بن کر ان کی متاع بے بہا ہے۔ انہوں نے اس توانائی کو نہ صرف اپنے اوپر منکشف کیا بلکہ اسے اپنے نظریہ حیات کی تجسیم و تشکیل کے لیے بھی برتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مقصدیت یا نظریہ محض عقلی نہیں بلکہ شخصیت کی جامعیت کی پیدا کردہ ہے، اور ''نوائے شوق'' میں ڈھل کر جمالیاتی آب و

تاب حاصل کرتی ہے۔

اقبال کے باطن میں کائناتی توانائی جلال و جمال کے لازوال سرچشموں میں منتقل ہوگئی ہے۔ مسجد قرطبہ ہو، ساقی نامہ ہو، ذوق وشوق ہو یا ''بال جبریل'' کی غزلیں، جلال و جمال کے ان ہی سرچشموں سے سیراب ہیں۔ ان کے شعری عمل میں ٹھوس اور بیّن انفرادیت ہے، اور یہ انفرادیت ان کی نگاہ شوق کی دین ہے۔

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبار جہاں
نگاہ شوق اگر ہو شریک بینائی

یہی وجہ ہے انہوں نے شاعری کے روایتی موضوعات اور اسالیب سے انحراف کیا اور ایک ایسی شعری دنیا کے مالک بن گئے، جو انہوں نے خود پیدا کی۔

وہی جہاں ہے ترا تو کرے جسے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

روایت سے اپنا سفر شروع کرنے کے باوجود انہوں نے جدت کا راستہ نکالا۔ شروع میں انہوں نے نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی، جیسے عشق کے پیش پا افتادہ مضامین نظم کیے، لیکن ''بانگ درا'' کے ابتدائی دور سے ہی انہیں تلاش، جستجو اور تجسس کا جذبہ و بے اطمینانی اور کرب سے آشنا کرتا رہا۔ وہ فطرت اور انسان کے رشتوں پر استفہامیہ نظر ڈالتے رہے۔ وہ ''رہ نورد شوق'' تھے اور ہر مقام سے آگے کے مقام کی تلاش کرتے رہے۔

یورپ سے لوٹنے پر فکر و فلسفہ کے گہرے مطالعے اور عہد حاضر میں انسانی صورت حال کا سامنا کرنے پر انہیں محسوس ہوا کہ جہد للبقا میں روایتی عشقیہ شاعری یا متصوفانہ شاعری شاید کوئی عملی کام نہیں دے سکتی۔ وہ اپنے شوق کو عورتوں سے باتیں کرنے یا ذات کی نفی کے لئے وقف کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے لیے شوق عشق بن گیا اور معجزہ کار ہو گیا۔

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

•••

عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نورِ حیات ، عشق سے نارِ حیات

(مسجد قرطبہ)

•••

عقل و دل ونگاہ کا مرشد اولین ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات

(ذوق وشوق)

شوق کا یہی تصور ان کی مقصدیت بھی ہے اور شعری محرک بھی ، اور دونوں کے اتصال سے اس کی انفرادیت مسلم ہوجاتی ہے۔ اس طرح سے ان کی شاعری روایتی عشقیہ شاعری سے الگ ہوجاتی ہے۔ یہ ہنگامی جذبات رشتوں کے بجائے عالم گیر انسانی صورت حال سے مربوط ہوجاتی ہے۔ کلاسیکی شعرا میں شوق انسان کی باطنی قوت کو محیط ہے، جو کائناتی قوت کے مماثل ہے۔

شوق ہے سامان طراز نازش ارباب عجز
ذرہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا

تاہم غالب کے یہاں انسان کی ازلی قوت کی موجودگی اس کے اثبات واظہار تک ہی محدود ہے۔ برعکس اس کے اقبال اسے انسانیت کی بہبود اور برکت کے لئے استعمال کرنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔ اقبال کے یہاں یہ قوت مقصدیت میں ڈھل کر جمالیاتی ترفع میں بدل جاتی ہے البتہ جن اشعار میں یہ عمل واقع نہیں ہوتا وہاں کلام منظوم وجود میں آتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو عالمی سطح پر تخلیقی عمل کے پس پشت کائناتی توانائی ہی ہے اور یہی فنون لطیفہ کی صورت میں اس کے بنیادی محرک کا کام کرتی ہے اور یہی اس کا جواز بھی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مختلف شعرا ''فکر ہرکس بقدر ہمت اوست'' کے مصداق اپنی استعداد، فکر اور بصیرت کے مطابق اس سے مستفیض ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ تخلیقی قوت مختلف شعرا کے یہاں مختلف درجات کی مظہر ہوتی ہے اور یوں پست وبلند کا تعین ہوتا ہے۔ غالب کے یہاں اس نے انا کے ساتھ ساتھ وجودی کرب کی متناقض صورت اختیار کی۔ حسرت موہانی کے یہاں یہ حسن وعشق کی کیفیات میں ڈھل گئی ہے اور فیض کے یہاں یہ معاشرتی کشمکش کے شعور کی تصویر بن گئی ہے۔ جو

بھی صورت ہو، یہ تخلیقی قوت ہی ہے جو تخلیق فن میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ عام طور پر شعرا کی تخلیق شعر کے دوران خود رفتگی، استغراق اور محویت سے گذرنا، دراصل شعور کے بجائے لاشعور کی کارفرمائی کو قبول کرنا ہے اور یہ تخلیقی قوت ہی سے رشتہ قائم کرنے کے مترادف ہے۔

آخر میں ''بال جبریل'' کے اس شعر جس کا پہلا مصرع مضمون کے شروع میں عرض کیا گیا، یعنی

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

کی قرأت سے شعر کے پہلے لفظ ''میری'' پر قدرے زور ڈالنے سے متکلم اپنی نوائے شوق کی اثر پذیری کو اپنے اور صرف اپنے آپ سے مختص کرتا ہے اور ''مردے خود آگاہ ہے'' ہونے کے دعوے کو تقویت دیتے ہیں۔ نوائے شوق کے حریم ذات میں شور آفرینی انسان کے خلیفۃ الارض ہونے کا اشاریہ ہے۔ یہ اقبال ہی ہیں جو اپنی تخلیقی قوت کی بنا پر حریم ذات میں شور پیدا کرنے اور بت کدۂ صفات یعنی دنیا میں غلغلہ پیدا کرنے کی جسارت کرتے ہیں اور اپنی نوائے شوق کو ''سوز حیات ابدی'' میں بدل دیتے ہیں۔

(ماخوذ ماہنامہ ''شب خون''، فروری ۲۰۰۲ء)

☆☆☆

سید احمد ایثار (بنگلور)

تصانیف اقبال کے تراجم
ایک اجمالی تذکرہ

اللہ تعالیٰ نے ایک ہی مرد اور عورت سے بنی نوع انسان کو پیدا کیا ہے۔ آپسی پہچان کے لئے انہیں مختلف رنگ و نسل، قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کر کے کرۂ ارض پر آباد کیا ہے۔ انہیں ایک دوسرے کو اور خالق کائنات کو سمجھنے کے لئے مختلف بولیاں اور زبانیں عطا کی ہیں۔ علم الاسماء ودیعت کرنے کے بعد تسخیر کائنات کے لئے قوت تخلیقی سے سرفراز کیا ہے، تاکہ زندگی کو خوشگوار، خوبصورت اور خوشحال بنانے کی کوشش کریں۔ آج دنیا میں جو بھی علم و ادب کی رونق ہے اور آئندہ ہوگی وہ اسی قوتِ تخلیق کا کرشمہ ہے۔ لیکن اللہ نے علم و ادب اور عرفان کو تمام بنی نوع انسان کی مشترکہ میراث بنایا ہے۔ چنانچہ مختلف زبانوں کے حامل انسانی گروہ اور قومیں جب بھی ایک دوسرے کے قریب آئی ہیں۔ خواہ اس کے اسباب و محرکات، جو بھی کچھ ہوں انہوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا ہے۔ ایک دوسرے کے علم و ادب کو اپنی زبانوں میں منتقل کر کے انسانی تہذیب و تمدن کو مالا مال کیا ہے۔ اسی انتقالِ علم و ادب کا نام ترجمہ ہے اور فروغ علم و ادب فنِ ترجمہ کا رہینِ منت رہا ہے۔ لہذا ترجمہ کی اہمیت تخلیق سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

ظہورِ اسلام کے بعد جب عربوں کا دورِ اقتدار شروع ہوا تو وہ بغرض تبلیغ و اشاعت اسلام اقصائے عالم میں پھیل گئے۔ فتوحات کی بدولت غیر ممالک میں ان کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ وہ مختلف تہذیبوں اور زبانوں سے دوچار ہوئے۔ خالص اسلامی اقدار کی حامل ایک نئی عرب قوم نہ صرف دوسری قوموں پر اثر انداز ہوئی بلکہ خود اثر پذیر بھی ہوئی۔ مختلف قوموں کے ساتھ علمی، ادبی، ثقافتی اور لسانی اختلاط اور لین دین کا ایک زبردست سلسلہ شروع ہوا۔ اموی اور عباسیہ دور میں تراجم کے بڑے بڑے شعبے قائم ہوئے۔ عربوں نے غیر زبانوں کے علمی و ادبی اثاثوں کو عربی

زبان میں منتقل کر کے نہ صرف ان کو تباہی سے بچایا بلکہ خود اپنی طرف سے اس میں بیش بہا اضافے کئے۔ علم و ادب کی روشنی چاروں طرف پھیلائی۔ اس طرح صدیاں گزر گئیں۔ جب عربوں کا اقتدار گھٹ گیا، حکومتیں چھن گئیں تو علم و ادب کے یہ عظیم ذخیرے مغرب کے فاتحوں کے ہاتھ لگے، جن کی بنیادوں پر آج کی سائنس و ٹکنالوجی کی تحیر افزا عمارتیں کھڑی کی گئی ہیں۔ لہذا آج علم و ادب کی ترقی اور فروغ میں تخلیق کا جتنا حصہ ہے ترجمہ کا حصہ بھی اس کے برابر نہیں تو کم نہیں ہے۔

اگر ایرانی لٹریچر اطالوی زبان میں منتقل نہ ہوتا تو گوئٹے، نہ حافظ شیراز سے آشنا ہوتا اور نہ ان کے کلام سے، اسی طرح وہ ترجموں ہی کے ذریعہ تخیلات میں شیخ عطار سعدی فردوسی اور عام اسلامی لٹریچر کا بھی ممنون احسان ہے۔ اس کے اندر ردیف و قافیہ کے استعمال کا شعور بھی پیدا ہوا۔ نتیجہ کے طور پر اس نے ''دیوان مغرب'' کی تخلیق کے ذریعہ اپنی احسان مندی کا اعتراف کیا اسی طرح واقعاتِ معراج نبویؐ، ابن عربی کی تصنیف ''فتوحات مکیہ'' اور ان کے کشف، نیز ابوالعلاء معرّیٰ کے رسالہ الغفر ان کے تراجم ڈانٹے کو میسر نہ آتے تو اس کی ''ڈیوائن کامیڈی'' کی تصنیف کے لئے اسے سیر آسمانی اور جنت و دوزخ کی تفصیلات کیسے حاصل ہوتیں؟

علامہ اقبال اپنے عہد کے عظیم مفکر، فلسفی اور شاعر تھے۔ آپ کی شخصیت میں مغرب و مشرق کے علوم کا نہایت درجہ حسین امتزاج تھا۔ اپنی غیر معمولی ذہانت و فطانت اور نکتہ رس صلاحیت سے آپ نے ایک نایاب قوام تیار کرلیا تھا، زمانے کے حالات نے جب ان کے وجدان کو مہمیز کیا تو انہوں نے یکے بعد دیگرے شہکار تصانیف پیش کیں، جن کا شمار ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔ کلام اقبال بلند خیالات، زندگی کی اعلیٰ قدروں اور جمالیات کے ایک خاص معیار کا حامل ہے۔ اگرچہ اقبال کی شہرت اور عام مقبولیت ان کے فکر و تدبر کی بنا پر ہے لیکن ان کا فنکارانہ کمال بھی عام روش سے جدا ہے۔ ان کے فکر و فن کی یہی ہم آہنگی انہیں دنیائے شعر و ادب میں ممتاز کرتی ہے۔ فکر و کلام اقبال عالم انسانیت کیلئے ایک علم نافع کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ دیگر زبانوں کے قدآور عالموں اور زبان دانوں نے کلام اقبال کے جواہرات کو لوٹ کر اپنے خزانے بھر لئے ہیں۔ علامہ اقبال برصغیر کے خوش نصیب شاعر ہیں جن کے کلام کے ترجموں اور اقبالیات پر تصانیف کے انبار لگ گئے ہیں۔ اس مضمون میں علامہ اقبال کی تصانیف کے انبار لگ گئے ہیں۔ اس مضمون میں علامہ اقبال کی تصانیف کے ترجموں کا تذکرہ ہے۔

علامہ قبال کی تصانیف اردو میں چار، فارسی میں سات اور انگریزی میں دو ہیں جن کی

تفصیل درج ذیل ہیں:

اردو تصانیف

	نام	سال اشاعت
ا۔	علم الاقتصاد	1904
۲	بانگ درا	1924
۳	بال جبریل	1935
۴	ضرب کلیم	9136

فارسی تصانیف

۱	اسرار خودی	1915
۲	رموز بے خودی	1918
۳	پیام مشرق	1923
۴	زبور عجم	1927
۵	جاوید نامہ	1932
۶	مسافر	1934
۷	پس چہ باید کرد	1936
۸	ارمغان حجاز	1938 بعد انتقال

انگریزی تصانیف:

1.The Development of meta physics in Persia
2.Reconstruction of Religious Thought in Islam

علامہ اقبال کی اصل تصانیف 14 تھیں، بعد میں پس چہ باید کرد اے اقوام شرق کے ساتھ مثنوی مسافر، کو منسلک کر دینے سے 13 ہو گئیں۔ سوائے علم الاقتصاد، کے باقی بارہ تصانیف کے تراجم مختلف زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔

اقبال اکیڈیمی حیدر آباد کی فراہم کردہ اور میری محدود معلومات کے مطابق، اب تک علامہ اقبال کی تصانیف کے 165 تراجم دنیا کی 25 زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ یہ تراجم ان کی مکمل کتابوں کے ہیں اور مترجموں کی تعداد 111 ہے۔ ان کے علاوہ منتخب منظومات، خطوط اور

خطبات کے سترجم بھی کئی ہیں۔ تراجم منظوم اور منثور دونوں قسم کے ہیں۔ منظوم تراجم میں بعض مترجمین نے اصل متن کی بحروں کو قائم رکھا ہے اور بعض نے بحروں میں تبدیلی بھی کی ہے۔ بعض مترجمین نے اپنے ترجمے کے ساتھ ساتھ اصل متن کو بھی برقرار رکھا ہے۔ ایک مختصر سے مضمون میں ان تمام کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہاں صرف اس تفصیل کا اجمال پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال کی مکمل کتابوں کے تراجم اور زبانیں درج ذیل ہیں:

تصانیف فارسی	تعداد تراجم......	زبانیں
اسرار خودی	27......	11......
رموز بے خودی	18......	9......
پیام مشرق	19......	10......
زبور عجم	17......	10......
جاوید نامہ	25......	10......
پس چہ باید کرد	13......	5......
ارمغان حجاز	19......	7......

تصانیف اردو

بانگ درا	6......	6......
بال جبریل	8......	5......
ضرب کلیم	6......	5......

تصانیف انگریزی

فلسفہ عجم Teh Development of metaphysics کا ترجمہ	2	2
تشکیل جدید الہیات اسلامیہ Reconstruction of Religious Thought in Islam کا ترجمہ	6	8

پیش کردہ اعداد و شمار سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال کے اردو کلام کی بہ نسبت فارسی کلام کے زیادہ تراجمے ہوئے ہیں۔ ان میں تعداد تراجم کے لحاظ سے ''اسرار خودی'' سرفہرست ہے جس کے گیارہ زبانوں میں 27 ترجمے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد جاوید نامہ، کا نمبر آتا ہے جس کے دس زبانوں میں 26 تراجم ہیں۔ اسی طرح اردو کتابوں میں ''بال جبریل'' کے آٹھ تراجم ہیں ''ضرب کلیم'' کے چھ اور بانگ درا کے صرف سات ہوئے ہیں۔ ذیل میں ایک ایک کتاب اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کا ذکر پیش ہے:

اسرار خودی

یہ علامہ اقبال کی پہلی فارسی تصنیف ہے۔ معنوی لحاظ سے آپ کی تمام کتابوں پر بھاری اور مضامین کے لحاظ سے سب پر محیط ہے۔ اس مثنوی میں اقبال نے قرآنی تعلیمات کی اساس پر اپنا فلسفۂ خودی مرتب کیا اور اس کے ذریعہ فرد کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے اور اسے عمل پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اقبال کے فکر و فلسفہ کا محور ہے اور انہوں نے آخر تک اس کی وضاحت میں اپنا سارا زور قلم صرف کر ڈالا۔ خودی کی تحقیق علامہ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس کی افادیت نہ صرف مسلمانوں تک محدود ہے بلکہ یہ ساری انسانیت اور کل بنی آدم کے لئے کام کی چیز ہے۔ اس لئے دیگر قوموں اور زبانوں کے لئے بھی اس میں بڑی کشش ہے۔

جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس کی انقلابی تعلیمات نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ ایک طرف ہندوستانی مشائخ اقبال کو مخالف تصوف سمجھ کر ہلڑ مچانے لگے تو دوسری طرف انگلستان میں آپ ہی کے ایک استاد پروفیسر نکلسن کے دل کو یہ نظریہ اتنا بھایا کہ وہ اس کے ترجمہ کی دھن میں لگ گئے۔ بالآخر 1920ء میں پروفیسر نکلسن نے The Secrets of self کے نام سے اس کا ترجمہ شائع کیا اور اپنی قوم کو اقبال کے فکر و فن سے روشناس کرایا۔

اردو زبان میں ''اسرار خودی'' کا اولین ترجمہ جسٹس ایس اے رحمٰن نے کیا اور 1952ء میں لاہور سے شائع کرایا۔ اس کتاب کے اب تک گیارہ زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں اور اس کے جملہ 27 مترجم ہیں۔ ترجموں کی تفصیل یوں ہے: بزبان اردو 12۔ انگریزی، پنجابی، سندھی اور سویڈش زبانوں میں دو دو۔ انڈونیشی، پشتو، ترکی، کشمیری، عربی، تاجیک اور ملیالم میں ایک ایک۔

رموز بے خودی

یہ مثنوی 'اسرار خودی' ہی کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میں اجتماعی خودی سے بحث کی گئی ہے۔ کیونکہ فرد کی خودی کی تکمیل جماعت میں رہ کر ہی ہوتی ہے۔ اس کتاب کا 9 زبانوں میں ترجمہ ہوا

ہے۔ اوراس کے مترجموں کی تعداد 11 ہے تراجم اردو میں پانچ ، انگریزی میں تین، پشتو میں ایک، سندھی ایک اور بنگالی میں ایک ہے۔

جاوید نامہ

یہ دراصل علامہ اقبال کا معراج نامہ ہے۔ اس کتاب کی تخلیق کے لئے علامہ کوڈانٹے کی ''ڈیوائن کامیڈی'' سے تحریک ملی تھی۔ علامہ خود پروفیسر شجاع کو اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: ''جاوید نامہ'' ایک قسم کی ڈیوائن کامیڈی ہے، اور مثنوی مولانا روم کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں علامہ مولانا روم کی معیت میں آسمانوں کی سیر کرتے ہیں اور حتی کہ باری تعالیٰ کی حضوری سے مشرف ہوکر سوالات کرتے اور جوابات سے باریاب ہوتے ہیں۔ راقم الحروف کے ترجمے میں اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے پروفیسر آغا مرزا محمود سروش لکھتے ہیں ''جاوید نامہ اقبال کا ادبی شاہکار ہے۔ یہ اقبال کا Magnum Opus ہے۔''

عبدالغنی رقم طراز ہیں کہ: ''اپنے مضامین کی وسعت، موضوعات کے تنوع، کرداروں کی رنگارنگی مناظر کی دل کشی اور افکار کی گہرائی، اشعار کی ساحری، تصورات کی آفاقیت کے لحاظ سے دنیا کی کوئی شعری تخلیق اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ یہ وہ شاعری ہے جوڈانٹے کے بس کی بات نہیں۔''

تراجم کی کثرت میں ''جاوید نامہ'' کا مقام دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ جملہ تراجم کی تعداد 26 ہے اور دس زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ تفصیل یوں ہے: اردو میں سات، انگریزی میں سات، عربی میں تین، فرانسیسی میں دو اور اطالوی، پشتو، ہندی، پنجابی، ترکی، جرمن، تاجیک میں ایک ایک مترجموں کی تعداد 25 ہے۔ کرناٹک کے حضرت بی شیخ علی صاحب نے انگریزی میں بڑے دل نشین انداز میں اس کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہندی میں ڈاکٹر شیث نے بھی ترجمہ کیا ہے۔

پیام مشرق

یہ کتاب گوئٹے کی کتاب ''دیوان مغرب'' کا جواب ہے۔ اس کتاب کے سلسلہ میں پروفیسر مسعود حسین خان فرماتے ہیں۔ اقبال کے فارسی کلام میں ''پیامِ مشرق'' کا ایک خاص مقام ہے۔ ہر چند انہوں نے ''زبور عجم'' کو اپنا پسندیدہ مجموعہ کہا ہے۔

؎ اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبور عجم

اور ''جاوید نامہ'' کو اپنی زندگی کا ماحصل بتایا ہے۔ ''پیام مشرق'' کئی لحاظ سے ان پر اولیت رکھتا ہے۔ ''زبور عجم'' کی مقبولیت اس کی غزلوں کی لہک سے غنائیت میں ہے اور ''جاوید

نامہ'' ڈانٹے کی ''طربیہ خداوندی'' کے انداز پر ایک ڈرامائی کینوس کی حامل ہے۔ لیکن ''پیام مشرق'' جو بقول اقبال شاعرالمانوی گوئٹے کے ''دیوان مغرب'' کے جواب پر تصنیف کی گئی ہے، اپنی رباعیات (لالہ طور) نظمیات، افکار (مئے باقی) اور نقش فرنگ کی مشتملات کی بناء پر ایک مکمل مجموعہ شعر ہے۔ اس مجموعہ شعر میں اقبال کا تخلیقی ذہن اپنی معراج کمال پر ہے اور شعریت کا یہ عالم ہے کہ کیا رباعیات' کیا نظمیں اور غزلیں ہر جگہ گنجینۂ معنی کے طلسم کا احساس ہوتا ہے۔''

اس کتاب کے دس زبانوں میں جملہ 19 تراجم ہیں۔ اردو میں سات، انگریزی میں تین فرانسیسی میں دو، پشتو، ترکی، جرمن، سندھی، عربی، گجراتی اور تاجیک میں ایک ایک اس کے مترجمین کی تعداد بھی 19 ہے۔

زبور عجم

یہ کتاب مترنم غزلوں اور ''گلشن راز جدید'' کے عارفانہ جوابات پر مشتمل مثنوی ہے اور خود علامہ کی پسندیدہ تصنیف ہے۔ اس کے جملہ تراجم 18 اور مترجم بھی 18 ہیں۔ زبانوں کے لحاظ سے اردو میں چھ، انگریزی میں تین، ترکی میں دو اور پشتو، پنجابی، سندھی، سرائیکی، عربی، گجراتی، تاجیک میں ایک ایک۔

پس چہ باید کرد

اس کے تیرہ تراجم اور تیرہ مترجم ہیں۔ اردو زبانوں میں نو، انگریزی، پشتو، عربی اور تاجیک میں ایک ایک ترجمہ ہوا ہے۔

ارمغان حجاز

اس کتاب کے اولین دو حصے علامہ اقبال کے تصوراتی حج سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی چوبیس ابواب (چھوٹے بڑے) متفرق موضوعات پر مشتمل ہیں۔ اس کتاب کے 19 ترجمے اور انیس ہی مترجم ہیں۔ اردو میں 12، عربی میں دو، باقی بنگالی، پشتو، پنجابی، ترکی اور سندھی میں ایک ایک۔

بانگ درا

تلگو، انگریزی، عربی، پشتو، ملیالم اور مراٹھی میں ایک ایک ترجمہ ہوا ہے۔ ایک ترجمہ جاپانی زبان میں بھی ہوا ہے۔ جملہ سات تراجم ہیں۔

بال جبریل

انگریزی اور پشتو میں دو دو، بنگالی، پنجابی، سرائیکی اور عربی میں ایک ایک ترجمہ۔

ضربِ کلیم

انگریزی میں دو، پشتو، ترکی، عربی فارسی میں ایک ایک، جملہ چھ تراجم ہیں۔

فلسفۂ عجم

اس کے صرف تین تراجم ہیں۔ بنگالی میں دو اور فارسی میں ایک۔ اور اردو میں ایک

تشکیل جدید الٰہیات

اس کتاب کے آٹھ تراجم ہیں۔ پنجابی اور فارسی میں دو دو، اردو، پشتو، ترکی اور فرانسیسی میں ایک ایک۔ اردو بک ریویو (شمارہ مئی جون 2008ء) میں شائع شدہ، ایک اشتہار کے مطابق علامہ کے فرزند ارجمند جسٹس جاوید اقبال نے ''تسہیل و تفہیم'' کے عنوان سے ایک تازہ اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔

متفرقات

اس حصہ میں اقبال کے متعدد منظومات کے مختلف زبانوں میں کافی بڑی تعداد میں ترجمے ملتے ہیں۔ اس میں ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' کے تراجم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے انگریزی میں آٹھ، بنگالی میں چار، پنجابی میں تین، عربی میں دو اور پشتو میں ایک ترجمہ ملتا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر منظومات میں طلوع اسلام، تصویر درد، مسجد قرطبہ، سسلی، فاطمہ بنت عبداللہ، لالہ طور، شمع و شاعر، خضر راہ گلشن راز جدید، نیا شوالہ، بچوں کے گیت وغیرہ کے مختلف زبانوں میں تراجم کئے گئے ہیں۔ جناب رؤف خیر نے ''قنطار'' کے عنوان سے اور پروفیسر شہاب نے ''دو آتشہ'' کے نام سے ''پیام مشرق'' کی ''لالۂ طور'' والی رباعیات کا ترجمہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں علامہ کے صدارتی خطبات کے تراجم مختلف زبانوں میں کئے گئے ہیں۔

دستیاب معلومات کے مطابق، عبدالعلیم صدیقی واحد مترجم ہیں، جنھوں نے علامہ اقبال کی فارسی تصانیف (سوائے ارمغان حجاز کے) کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ چار فارسی کتابوں کے ترجموں میں عربی میں حسین مجیب المصری اور اردو میں مضطر مجاز (ارمغان حجاز، پس چہ باید کرد، جاوید نامہ اور پیام مشرق) کے نام آتے ہیں۔ عربی میں تین کتابوں کا ترجمہ عبدالوہاب عزام نے کیا ہے۔ اگر خود ستائی پر محمول نہ کیا جائے تو آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ناچیز کو علامہ اقبال کی

ساتوں فارسی تصانیف کا منظوم ترجمہ کرنے کا شرف حاصل ہے۔ پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد شائع ہو چکے ہیں۔ اسرار خودی اور رموز بے خودی کی اشاعت ہو چکی ہے۔ ارمغان حجاز کا ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

علامہ اقبال برصغیر کے واحد شاعر ہیں جنہوں نے اپنے اردو اور فارسی کلام سے نہ صرف برصغیر کی مختلف زبانوں کے شعراء وادباء کو متاثر کیا ہے بلکہ ایشیا اور یوروپ کے لوگوں کا بھی دل موہ لیا ہے۔ یہ ان کے کلام کی آفاقیت کا کمال ہے کہ ان کی کتابوں کے اتنی زبانوں میں اور اتنے زیادہ ترجمے ہوئے ہیں۔

میری معلومات کے مطابق، اقبال کے تراجم کا یہ سلسلہ آج بھی یہاں اردو میں جاری ہے۔ اس کے علاوہ اور کہاں کہاں اور کن کن زبانوں میں ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے یہ بتانا مشکل ہے۔

نوٹ۔ فاضل مقالہ نگارنے معزز قارئین سے گذارش کی ہے کہ وہ فرد گزاشتوں سے صرف نظرکرتے ہوئے مزیدمعلومات سے آگاہ فرماکر ممنون فرمائیں (ادارہ)

پتہ سید احمد ایثار

967 شیر خان اسٹریٹ نگرتھ پیٹھ بنگلور 560002

☆☆☆

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی
پروفیسر، شعبۂ اقبالیات،
پنجاب یونیورسٹی، لاہور

علامہ اقبال کا ذوقِ علم و تحقیق

(۱)

حیاتِ اقبال کی معروف روایت ہے کہ ایک دفعہ نصف شب کے قریب (والدۂ اقبال) امام بی کی آنکھ کھلی تو انہوں نے دیکھا کہ اقبال دِیے کے قریب بیٹھا اسکول کا کام کر رہا ہے۔ انہوں نے دو ایک آوازیں دیں، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر اٹھ کر اسے شانوں سے پکڑ کر ہلایا اور کہا:

''اقبال! اس وقت آدھی رات کو کیا پڑھ رہے ہو؟ اٹھو، سو جاؤ، صبح کام کر لینا''۔ اقبال نے جواب دیا: ''بے جی! سویا ہوا تو ہوں۔'' اس کی آواز سے لگتا تھا کہ کسی اور دنیا سے بول رہا ہے۔ یہ کیفیت دیکھ کر والدۂ اقبال کچھ فکر مند ہوئیں اور روز رات کو کئی بار اٹھ کر دیکھتیں اور اکثر انہیں اسی حالت میں پاتیں اور اٹھ کر سلاتیں۔ (۱)

کہا جا سکتا ہے کہ ذوقِ مطالعہ بچپن ہی سے اقبال کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اگرچہ لکھنے پڑھنے کا یہ شوق انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا، تاہم یہ اقبال کی خوش بختی تھی کہ انہیں مولانا سید میر حسن جیسے ''روشن فکر اہل علم'' کا تلمذ اور ان کی صحبت نصیب ہوئی، جو بقول ڈاکٹر جاوید اقبال: ''مصالحِ دین اور مصالحِ دنیا کو ایک ساتھ پیش نظر رکھ کر، شاگردوں کی تربیت کرتے تھے۔ وہ نہ صرف علومِ اسلامی اور عرفان و تصوف سے آگاہ تھے، بلکہ علومِ جدیدہ، ادبیات، لسانیات اور ریاضیات کے بھی ماہر تھے۔ ان کے پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ اپنے شاگردوں میں اردو فارسی اور عربی کا صحیح ذوق پیدا کر دیتے۔'' (۲)

اقبال کی تعلیمی زندگی کی نشو و نما میر حسن کے زیر اثر ہوئی۔ مکتب سے انٹرمیڈیٹ تک کے

مراحل ان ہی کی نگرانی میں طے ہوئے۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں اقبال کا سہ پہر اور شام کا وقت بھی میر حسن کے ہاں گزرتا۔ یوں میر حسن اقبال کے کل وقتی استاد تھے۔

وہ اپنے شاگردوں میں حصول علم کا ذوق و شوق پیدا کرنے کے لئے برابر کوشاں رہتے۔ (۳) ان کی کاوشوں سے بیسیوں طلبہ کی زندگی سنور گئی اور وہ اعلیٰ عہدوں تک پہنچے۔ ان سب میں اقبال، میر حسن کی اس تعلیم و تربیت سے غالباً سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں: ''سید میر حسن نے اقبال کو عربی، فارسی اور اردو ادبیات، علم و حکمت، تصوف وغیرہ کی تعلیم دے کر ان کے دل میں علوم قدیمہ اور اسلامیہ کے لئے بے پناہ شیفتگی پیدا کر دی تھی۔ (۴)

گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانۂ طالب علمی میں یوں تو انہوں نے متعدد اساتذہ (لالہ جیا رام، محمد دین فوق کشمیری، مولانا ابوسعید، محمد شعیب، مولانا فیض الحسن سہارن پوری) سے کسب فیض کیا(۵) مگر اقبال کے ذوقِ مطالعہ و تحقیق کو جلا بخشنے میں پروفیسر تھامس واکر آرنلڈ (۱۸۶۴ء۔۱۹۳۰ء) سرفہرست ہیں۔ اقبال کو ان کی شاگردی کا موقع ایم اے (فلسفہ) کے آخری سال (۹۹۔۱۸۹۸ء) میں فقط چند ماہ تک ہی ملا، تاہم آرنلڈ جیسے ''شفیق اور کردار ساز استاد'' سے کسب فیض کا یہ مختصر زمانہ اقبال کے لئے ایک یادگار سرمایۂ افتخار ثابت ہوا۔ پروفیسر آرنلڈ سرتاپا ایک علم دوست شخص تھے۔ اپنے طالب علموں کو برابر کتب بینی کی طرف راغب کیا کرتے۔ مطالعے کے لئے کتابوں کے نام تجویز کرتے۔ تحریری مشق کے لئے بعض موضوعات بتاتے اور پھر ان موضوعات پر اپنے شاگردوں سے تبادلۂ خیال بھی کرتے۔ دراصل وہ خالص علمی مزاج کے حامل انسان (academician) تھے۔ بقول شیخ عبدالقادر: ''وہ علمی جستجو اور تلاش کے طریق جدید سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے چاہا کہ اپنے شاگرد (اقبال) کو اپنے مذاق اور طرزِ عمل سے حصہ دیں اور اس ارادے میں بہت کچھ کامیاب بھی ہوئے (۶)۔ انہوں نے اقبال جیسے جوہرِ قابل کو اس طرح چمکایا کہ خود آرنلڈ کو کہنا پڑا کہ ایسا شاگرد، استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے۔ (۷)

ایم اے فلسفہ کی تکمیل پر اقبال اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عربیک ریڈر مقرر ہوئے

تو اس زمانے میں آرنلڈ کالج کے قائم مقام پرنسپل تھے، چنانچہ یہاں بھی اقبال کو ان کی صحبت و رفاقت علمی میسر رہی۔ خود اقبال کو تدریس تحقیق کے لئے مختلف مضامین اور موضوعات پر وسیع مطالعہ کرنا پڑا، خصوصاً معاشیات اور تاریخ پر ہر روز لیکچر کے لیے وہ اچھی خاصی تیاری کر کے آتے تھے (۸)۔ تدریسی ضرورت کے علاوہ بھی، وہ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے مختلف علوم سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے۔ مطالعہ ان کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ ان کے دیرینہ خادم: علی بخش (۱۸۸۳ء۔۱۹۶۹ء) کا بیان ہے کہ ان کے کمرے میں میز پر ڈھیروں کتابیں بے ترتیبی سے پڑی رہتیں۔ علی کو تاکید تھی کہ وہ کمرہ صاف کرتے وقت بکھری کتابوں کو نہ چھیڑے، بلکہ انہیں جوں کا توں رہنے دے۔

۱۹۰۵ء کے اوائل میں کانگڑے کا مشہور زلزلہ آیا، جس کے جھٹکے لاہور میں بھی بڑی شدت سے محسوس کیے گئے۔ اس زمانے میں اقبال اندرون بھاٹی گیٹ کے محلہ جلوٹیاں میں واقع ایک مکان کی بالائی منزل میں رہتے تھے۔ زلزلے کے وقت اقبال پلنگ پر لیٹے ایک کتاب پڑھ رہے تھے۔ علی بخش گھبراہٹ کے مارے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بھاگا بھاگا پھرنے لگا۔ اس کی بدحواسی دیکھ اقبال نے کتاب سے نظر ہٹائے بغیر کہا: ''علی بخش! ادھر ادھر نہ بھاگو، زینے میں جا کر کھڑے ہو جاؤ۔'' پھر کتاب کے مطالعے میں غرق ہو گئے۔'' (۹)

اورینٹل کالج میں معلمی کے علاوہ ان کی ذمہ داری تحقیق، تصنیف و تالیف اور ترجمہ کی بھی تھی، چنانچہ تدریس کے ساتھ ساتھ انہوں نے متعدد تحقیقی کام بھی انجام دیے، جن میں ایک تحقیقی مضمون The Docrine of Abosolute Unity As Expounded by Al-Jili اور علم الاقتصاد کی تالیف (۱۹۰۴ء) کے علاوہ دو غیر مطبوعہ کتابیں بھی شامل ہیں۔ (۱۰)

۱۹۰۴ء میں جب پروفیسر آرنلڈ ہندوستان سے رخصت ہو کر واپس وطن جا رہے تھے تو انہیں بڑی گرم جوشی سے رخصت کیا گیا۔ اقبال نے ''نالۂ فراق'' کے عنوان سے الوداعی نظم پڑھی (۱۱)، جس کے دو شعر ہیں:

تو کہاں ہے، اے کلیمِ ذروۂ سینائے علم
تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائیِ صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

یہی ''سودائے علم'' اور ''شوقِ رہ پیمائیِ صحرائے علم'' ۱۹۰۵ء میں اقبال کو اس ''ذروۂ سینائے علم'' کے پیچھے کشاں کشاں انگلستان لے گیا۔ یورپ کے تین سالہ قیام کے دوران میں انہیں استفادۂ علمی کے وسیع مواقع میسر آئے۔ کیمبرج اور میونخ کے اساتذہ، وہاں کے کتب خانوں، ڈاکٹر سید علی بلگرامی جیسے فاضلین کی صحبتوں کے علاوہ خود آرنلڈ سے ملاقاتوں، تبادلۂ خیالات اور مجموعی طور پر کیمبرج اور میونخ کے علمی ماحول نے اقبال کو بہت فائدہ پہنچایا۔ ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیقی کام کرتے ہوئے انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔ ان کا مقالہ اس اعلیٰ معیار کا تھا کہ آرنلڈ نے اسے ''تاریخ فکرِ اسلامی میں ایک بیش بہا اضافے کے مترادف'' قرار دیا اور میونخ میں اقبال کے نگران پروفیسر ہومل نے آرنلڈ کی تائید کی۔''(۱۲)

ڈاکٹریٹ کے زبانی امتحان کے موقع پر اقبال کی گفتگو اس قدر عالمانہ اور متاثر کن تھی کہ ان کی قابلیت اور علمی لیاقت کا کھلے بندوں اعتراف کیا گیا۔ ان کی سند پر یہ الفاظ لکھے گئے:

To the famous and learned man and exalted person.

SHEIKH MUHAMMAD IQBAL

after he has passed the rigorous examination with

great praise.

علامہ اقبال میر حسن اور آرنلڈ کے تلمذ وصحبت اور کیمبرج اور میونخ کے طریقِ تجسس و تحقیق سے جو کچھ حاصل کیا، اس کے نتیجے میں آیندہ چل کر ان کی علمی شخصیت کا اظہار کئی صورتوں میں سامنے آیا، مثلاً مطالعے کا شوق، پایانِ عمر ان کے دامن گیر رہا۔ اس غیر معمولی ذوق کا اندازہ، ان کے بعض ملاقاتیوں کی شہادتوں اور ان سے بھی زیادہ ان کے زیرِ مطالعہ کتابوں سے

ہوتا ہے، جو اَب اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں Iqbal Collection کے نام سے محفوظ ہیں۔ یہ کتابیں تقریباً ۳۰ مختلف موضوعات پر ہیں۔ ان سے اقبال کے ذوقِ مطالعہ کے تنوع کا اندازہ ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ کتابیں مابعد الطبعیات پر ہیں۔ دیگر نمایاں موضوعات میں مذہب، دینیات، نفسیات، سیاسیات، شعروادب، تاریخ، جغرافیہ اور سوانح شامل ہیں۔ ان کتابوں پر جگہ جگہ اقبال کے دست نوشت حواشی موجود ہیں۔ بعض مقامات پر مشکل الفاظ کے معانی اور کہیں مصنفین کے سوانحی اشارات بھی درج ہیں (۱۴)۔ (ان اشارات و حواشی کا مطالعہ بجائے خود اقبالیات کا ایک اہم موضوع تحقیق ہے۔)

(۲)

اس پس منظر سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبال فقط ایک شاعر ہی نہ تھے، علمی مسائل پر نظر عمیق رکھنے اور ان پر غور و فکر کرنے والے عالم اور محقق (scholar) بھی تھے۔ علمی تحقیق و جستجو کا یہ ذوق وقت کے ساتھ ان کی فطرتِ ثانیہ کا حصہ بن گیا تھا۔ ترکِ موالات کا مسئلہ ہو یا دارالحرب کی بحث ہو، زمان و مکان یا مہدیِ موعود کا موضوع ہو یا اجتہاد اور اس سے متعلقہ فقہی مباحث، فلسفی شاعر ہمیشہ ''گرم دمِ جستجو'' نظر آتا ہے۔ ان کے خطوط میں مختلف علوم کی ایسی بلند پایہ کتابوں کا بکثرت ذکر ملتا ہے، جو ان کے زیر مطالعہ ہوتیں، یا جن کی تلاش میں ہوتے یا احباب سے بعض عبارات کی صحت و استناد کے بارے میں استفسار کرتے۔ خواجہ عبدالوحید کہتے ہیں: ''میں کسی مذہبی، علمی یا ادبی مسئلے سے متعلق کوئی سوال کرتا، وہ فی الفور جواب دینا شروع کردیتے۔ ان کی وسعتِ معلومات کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا، جیسے انہیں پہلے سے میرے سوال کا علم تھا اور وہ اس کا جواب دینے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ وہ جب گفتگو کرتے تو میرے سامنے علوم و فنون کے بے شمار رازوں سے پردے اٹھنے لگے۔ (۱۵)

علامہ فکرِ انسانی کی نموپذیری کے قائل تھے۔ وہ سمجھتے تھے جوں جوں انسانی علم میں اضافہ ہوتا ہے، اس کے سامنے فکر و خیال کے نئے در وا ہوتے ہیں اور وہ امکانات کی نئی دنیاؤں سے آشنا ہوتا ہے (ہر لحظہ مومن کی نئی آن، نئی شان) یہ امکانات یہ تازگی اور یہ نیا پن مطالعہ کتاب،

فکر و تجسس اور تحقیق کے بغیر ممکن نہیں۔ اقبال اس کے قائل ہی نہیں اس پر عامل اور کار بند بھی تھے۔ عالم اسباب میں تو وہ قناعت پسند تھے، مگر علم و تحقیق میں یقیناً وہ حریص اور ھل من مزید کے طالب تھے۔

انگریزی خطبات میں اقبال نے لکھا تھا کہ فلسفیانہ مباحث میں حرف آخر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ غالباً اسی سبب سے وہ اپنے خطبات سے مطمئن نہیں تھے اور ان پر نظر ثانی کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح وہ اسلامی فقہ کی تدوینِ نو کے بھی شدید متمنی تھے اور ان کا خیال تھا کہ جو شخص یہ کارنامہ انجام دے گا، وہ عصر حاضر کا مجدد کہلائے گا (۱۶)۔ علامہ اقبال خود ایک مفکر و فلسفی اور دانشور تھے اور بجا طور پر انہیں بعض علمی موضوعات پر کچھ لکھنے اور کام کرنے کا خیال آتا رہا۔ خطبات سے قطع نظر، علامہ کی علمی تحقیق و جستجو کا ذکر ان کے تذکروں میں بہت کم ملتا ہے اور ان کی شخصیت کا یہ پہلو بالعموم نظروں سے اوجھل رہا ہے۔ ذیل میں ان کے بعض علمی منصوبوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۳)

ا۔ قرآن حکیم کے مطالعے اور اس پر برسوں کے فکر و تدبر کے نتائج کو مقدمۃ القرآن کے نام سے مرتب کرنا چاہتے تھے۔ ۱۹۲۳ء سے انہوں نے عزم کر لیا تھا کہ ''تفسیر قرآن از بس ضروری ہے'' (۱۷)۔ اس عزم کا پس منظر ان کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے، لکھتے ہیں: ''حق بات یہ ہے کہ جب ہم وید (وید کے بعد ایک لفظ پڑھا نہیں جا سکا۔ مرتب)...... انجیل وغیرہ کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد قرآن کا مطالعہ کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا خیالات کی ایک نئی فضا میں داخل ہو گئے ہیں۔ افسوس کہ مسلمانوں کو قرآن کی جدت کا کبھی احساس نہ ہوا، بلکہ انہوں نے اس جدید کتاب کے مطالب و حقائق کو قدیم اقوام کے خیالات کی روشنی میں تفسیر کر کے اس کے اصل مطلب و مفہوم کو مسخ کر دیا (۱۸)۔ مگر عملاً اس موضوع قلم اٹھانے میں ان کی کسرِ نفسی مانع رہی۔ ایک طرف اس اہم کام کا علمی تقاضا، دوسری جانب کسرِ نفسی اور اپنی 'کم علمی' نتیجہ یہ کہ ایک مدت تک وہ ذہنی کش مکش کا شکار رہے اور کچھ نہ لکھ سکے۔ موعودہ تفسیر کے لیے

انہوں نے مختلف اوقات میں تین مختلف نام تجویز کیے تھے:

1.An Introduction to the Study of Quran.

2. Aids to the Study of Quran.

3.An Interpretation of Holy Quran in the Light of Modern Philosophy.۱۹

وقت کے ساتھ ساتھ مقدمۃ القرآن لکھنے کی آرزو بڑھتی گئی۔ اس کا اندازہ بعض مکاتیب، بنام ڈاکٹر تاثیر، بنام سرراس مسعود اور بنام نذیر نیازی اور بعض گفتگوؤں (مثلاً عبدالرشید طارق) سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے(۲۰)۔

وہ اس علمی منصوبے کی تکمیل کے لیے بے چین اور مضطرب تھے۔ ایک بار عبدالرشید طارق سے فرمانے لگے: ایک بار کتاب شروع کی تو ان شاء اللہ اسلام کے بارے میں یورپ کی تمام theories (نظریات) کو توڑ پھوڑ کے رکھ دوں گا۔ ارادہ ہے، قانون کی تمام کتب بیچ کر فقہ، حدیث اور تفاسیر خریدوں گا'' (۲۱)۔ ریاست بھوپال سے ۵۰۰ روپے ماہوار پنشن مقرر ہوئی تو اپنے مالی مسائل سے قدرے مطمئن ہو گئے، لیکن ۱۹۳۴ء میں جب طویل علالت کا آغاز ہوا اور ان کی صحت رفتہ رفتہ خراب ہوتی گئی تو انہیں احساس ہوا کہ اپنے تمام عزم وارادے کے باوجود اب وہ یہ کام انجام نہ دے سکیں گے۔ سرراس مسعود کو ۳۰ رمئی ۱۹۳۵ء کو لکھتے ہیں:

''چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں، تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلم بند کر جاؤں۔ جو تھوڑی سی ہمت و طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے، اسے اسی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں، تاکہ (قیامت کے دن) آپ کے جدِ امجد (حضورِ نبی کریمؐ) کی زیارت مجھے اس اطمینانِ خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی، جو حضور نے ہم تک پہنچایا، کوئی خدمت بجالا سکا (۲۲)۔

اپنے بارے میں اقبال کا یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔ حیاتِ مستعار کا وقفہ ختم ہوا اور موعودہ تصنیف کا خیال عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔ سید نذیر نیازی لکھتے ہیں کہ ''اس سلسلے کی ان کی

ایک دو تحریریں ضرور دستیاب ہوئیں، (مگر) حضرتِ علامہ نے ان تحریروں میں صرف چند الفاظ مستفسرانہ انداز میں لکھے ہیں'' (۲۳)۔

نہیں کہا جا سکتا کہ موعودہ کتاب میں اقبال کیا طریق تفسیر اختیار کرتے، لیکن اس سلسلے کی بعض تحریروں اور گفتگوؤں سے واضح ہوتا ہے کہ مقدمۃ القرآن لکھنے سے اقبال کی بنیادی غایت خدمتِ دین تھی اور اپنی اس موعودہ کتاب میں وہ امتِ مسلمہ کو قرآنی رموز و نکات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے، تاکہ مسلمانانِ عالم اس کی روشنی میں اپنے سیاسی اور معاشی مسائل حل کر سکیں۔ وہ یہ بھی ارادہ رکھتے تھے کہ اسلام اور قرآن پر یورپ کے متعصبانہ اور بے بنیاد اعتراضات کا مدلل جواب دیا جائے۔ اگر اقبال مقدمۃ القرآن لکھنے میں کامیاب ہو جاتے تو بلاشبہ عصرِ حاضر میں یہ ان کا ایک بڑا علمی کارنامہ ہوتا۔

۲۔ دوسرا بڑا منصوبہ اسلامی فقہ کی جدید تدوین کا تھا۔ اس کو علامہ ''اسلام کی سب سے بڑی خدمت'' سمجھتے تھے۔ صوفی تبسم کے نام ۲؍ستمبر ۱۹۲۵ء کے خط میں لکھتے ہیں: ''میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نگاہ سے زمانۂ حال کے اصولِ قانون (jurisprudence) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم وہی شخص ہوگا'' (۲۴)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ فقہ اسلامی کی مفصل تاریخ کی ''سخت ضرورت'' پر بھی زور دیتے تھے (۲۵)۔ بلکہ ابتدائی زمانے میں انہوں نے فقہ اسلام پر بزبانِ انگریزی اپنے فن میں ایک بے نظیر کتاب لکھنا شروع کر دی تھی (۲۶)۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا انجام کیا ہوا، تاہم بعد میں علامہ نے Islam as I understand it کے نام سے ایک کتاب کا خاکہ بھی تیار کیا تھا (۲۷)۔ لیکن یہ تصنیفی منصوبہ بھی عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔

فقہ اسلام کی تاریخ و تدوین کے سلسلے میں انہوں نے مولانا شبلی، سید سلیمان ندوی اور سید انور شاہ کاشمیری کو لاہور بلانا چاہا، مگر ایسا نہ ہو سکا (۲۸)۔

۳۔ اسرارِ خودی کی اشاعت (۱۹۱۵ء) پر اقبال کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

بعض غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے انہوں نے تصوف کی تاریخ پر ایک مبسوط مضمون لکھنا شروع کیا، جو بعد میں پھیل کر ایک کتاب کی شکل اختیار کر گیا، محمد اسلم جیراج پوری کو لکھتے ہیں: ''میں نے ایک تاریخ، تصوف کی لکھنی شروع کی تھی، مگر ایک دو باب لکھ کر رہ گیا۔'' (۲۹)۔ یہ علمی منصوبہ بھی نا تمام رہا۔ (۳۰)۔

۴۔ اقبال کے موعودہ علمی منصوبوں اور تصنیفات و تالیفات میں بہت سی چیزیں شامل ہیں، مثلاً قلب و دماغ کی سرگذشت، ایک فراموش شدہ پیغمبر کی کتاب، فصوص الحکم پر تنقید، تاریخِ ادبِ اردو، کچھ دیگر متفرق چیزیں اور بعض تراجم شامل تھے۔ اقبال کے ان منصوبوں کا اہم ترین محرک ملی انحطاط کا وہ شدید احساس تھا، جس نے اقبال کو ساری عمر مضطرب رکھا۔ تصانیفِ موعودہ کے ذریعہ وہ قارئین میں دین کا فہم پیدا کر کے تجدید و احیائے اسلام کی راہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔ اپنے تصنیفی منصوبوں کا مقصد ان کے لیے ان کے اپنے بقول یہ تھا کہ ''میں اپنے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں پر دین کے اثرات منکشف کر جاؤں، تا کہ وہ دین کے قریب آ جائیں'' (۳۱)۔

(۴)

متذکرہ بالا عزائم اور ارادوں کے باوجود علامہ کو بجا طور پر احساس تھا اور برعظیم کی تاریخ اس کی موید ہے کہ بسا اوقات علمی منصوبے فردِ واحد کے بجائے اجتماعی کاوشوں اور علمی اداروں کے ذریعے ہی بروے کار آ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں علامہ یورپ کے علمی اداروں اور دانش گاہوں کا براہِ راست مشاہدہ کر چکے تھے۔

خواجہ عبدالوحید نے بعض دوسرے دوستوں سے مل کر ۱۹۲۸ء میں اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان نوجوانوں کو اسلامی تمدن و تاریخ کے مطالعے کی طرف راغب کیا جائے۔ وہ بتاتے ہیں کہ علامہ اقبال اس ادارے کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے تھے اور بعض کاموں میں وہ عملی تعاون بھی کرتے تھے۔ (۳۲)۔

اسی ضمن میں خواجہ عبدالواحد بتاتے ہیں کہ ۱۹۳۱ء میں علامہ کی تجویز پر اور ان ہی کی

رہنمائی میں علومِ اسلامیہ کی ترویج وتحقیق کے لیے لاہور میں ادارہ معارفِ اسلامیہ قائم کیا گیا۔ خواجہ عبدالوحید بتاتے ہیں کہ اس ادارے سے علامہ کا کوئی تنظیمی تعلق تو نہ تھا، لیکن ان ہی کی تجویز اوران ہی کی رہنمائی میں قائم کیا گیا تھا۔ وہی اس کے روحِ رواں تھے اور تمام کام ان ہی کے مشوروں سے انجام پاتے تھے۔ اقبال کو اس ادارے سے بڑی امیدیں تھیں اور وہ اسے ایک معیاری تحقیقی ادارہ بنانے کے خواہشمند تھے۔ انہوں نے اپنے اثر ورسوخ سے ریاست حیدرآباد دکن سے اس ادارے کے لیے سالانہ مالی امداد بھی منظور کرائی تھی (۳۳)۔

علمی منصوبوں کی تکمیل کے لے کوئی ایک ادارہ کافی نہیں ہوتا۔ خاطر خواہ نتائج مختلف النوع کاوشوں کے ذریعے ہی ممکن ہوتے ہیں۔ علامہ علمی تحقیق کے مسئلے پر وقتاً فوقتاً بعض احباب سے تبادلۂ خیال کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

> ''مدتِ دراز سے علامہ کے دماغ میں یہ تجویز گردش کررہی تھی کہ ایک علمی مرکز قائم کیا جائے، جہاں دینی ودنیاوی علوم کے ماہرین جمع کیے جائیں اوران ماہرین کو خوردونوش کی فکر سے بالکل آزاد کردیا جائے، تاکہ وہ ایک گوشے میں بیٹھ کر علامہ کے نصب العین کے مطابق اسلام، تاریخ اسلام اور شرع اسلام کے متعلق ایسی کتابیں لکھیں، جو آج کل کی دنیائے فکر میں انقلاب پیدا کردیں، چنانچہ ایک دفعہ مرزا جلال الدین بیرسٹر سے ذکر آیا تو انہوں نے ریاست بہاول پور میں سرکار بہاول پور کے زیر سرپرستی اس قسم کے ادارے کے قیام کا سروسامان درست کیا، لیکن ریاستوں کے معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں، معاملہ جو تعویق میں پڑا تو پھر اس کا کوئی سراغ ہی نہ ملا'' (۳۴)۔

مختلف علوم وفنون میں تحقیق وتصنیف کے ضمن میں علامہ کا ایک نہایت مفصل خط بنام صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بھی اہمیت رکھتا ہے (۳۵)، جس میں وہ اسلامی تاریخ، آرٹ، قانون اور تہذیب وتمدن کے مختلف پہلوؤں پر حاوی عالموں کی تیاری، ان کی تعلیم وتربیت اور اسلامی افکار اور ادبیات میں تحقیق کا ذکر کرتے ہیں۔ ۹ رجنوری ۱۹۳۸ء کو ہندوستان کے طول

وعرض میں ''یوم اقبال'' منایا گیا دیگر اکابر سیاست کی طرح پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات نے بھی اقبال کے لیے نیک تمناؤں کا پیغام بھیجا اور ساتھ ہی تجویز پیش کی کہ جہاں جہاں یوم اقبال منایا جائے، وہاں کے باشندے شاعر اعظم کی خدمت میں ایک تھیلی نذر کریں۔ علامہ اقبال نے یہ تجویز مسترد کر دی، فرمایا: بہتر ہوگا اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامی علوم کی تحقیق کے لئے ایک چیر یا خصوصی شعبہ قائم کیا جائے اور سرمایہ اس کے لیے فراہم کیا جائے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کہتے ہیں کہ اقبال کی بہت سی تمناؤں میں سے ایک تمنا یہ بھی تھی کہ کسی مسلم یونیورسٹی کے اندر یا کسی پرسکون مقام پر ایک چھوٹی سی بستی کی صورت میں ایسا ادارہ قائم کیا جائے، جس میں بہترین دل و دماغ کے مسلم نوجوان خالص اسلامی ماحول میں اسلامی ریاضیات، طبعیات، کیمیا، تاریخ، فقہ اور دینیات کی تعلیم حاصل کر کے علومِ جدیدہ کا علوم قدیمہ سے تعلق دریافت کر سکیں۔'' (۳۶)

یہ حسن اتفاق ہے کہ اسی زمانہ میں ایک دردمند مسلمان چودھری نیاز علی خاںؒ نے اپنی جائیداد، واقع جمال پور، پٹھان کوٹ، ضلع گورداسپور کا ایک حصہ خدمتِ دین کے لیے وقف کر کے وہاں ایک درس گاہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس سلسلے میں متعدد عمائدین اور علما سے راہ نمائی چاہی، جن میں مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ اقبال، عبدالماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی اور مولانا مودودی شامل تھے۔ (۳۷)۔ مجوزہ ادارے کے سلسلے میں مولانا مودودی نے انہیں ایک تفصیلی نقشہ بنا کر پیش کیا جس میں انہوں نے علمی کام کے لیے چار شعبوں (فقہ، معاشیات، علوم عمران، فلسفہ اور نظری سائنس) کی نشان دہی کی تھی۔ مولانا نے لکھا: ''سب علمی و تحقیقی کام اس بنیادی نظریے کے ساتھ کیا جائے کہ قرآن اور سنت ہی علم کا اصل منبع ہے۔ سب کچھ ہم کو اسی سے لینا ہے۔'' (۳۸)۔ عبدالمجید سالک لکھتے ہیں کہ اس پر چودھری صاحب نے علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر بتایا کہ میں نے ادارے کے لیے ایک بڑا قطعہ اراضی وقف کر دیا ہے، جس پر کتب خانہ، دارالمطالعہ اور مکانات تعمیر کیے جائیں گے، تاکہ علماء اور مصنفین یہاں رہ کر علوم اسلامی کی خدمت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کریں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں

نے مولانا کے علمی منصوبے سے بھی علامہ کو آگاہ کیا اور بتایا کہ دارالاسلام کے نام سے ادارہ قائم کرنے کا ارادہ ہے۔ حضرت علامہ، چودھری نیاز علی خان کی دین پروری سے بے حد خوش ہوئے اور انہیں دارالاسلام کے منصوبے میں اپنے خواب کی تعبیر نظر آئی۔

پٹھان کوٹ کے مجوزہ علمی مرکز کے لیے علامہ کو مصر سے کسی عالم دین کو بلانے کا خیال آیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے الازہر یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ، علامہ مصطفیٰ المراغی کو ایک خط لکھا، یہ خط اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس سے علامہ کے مجوزہ تحقیقی ادارے کے مقاصد اور اس کی صحیح نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ علامہ، مذکورہ خط میں لکھتے ہیں: ''ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ہم پنجاب کی ایک بستی میں ایک ایسے ادارے کی بنیاد رکھیں کہ اب تک کسی اور نے ایسا ادارہ قائم نہیں کیا اور انشاء اللہ اسے اسلامی دینی اداروں میں بہت اونچی حیثیت حاصل ہوگی۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کچھ ایسے لوگوں کو، جو جدید علوم سے بہرہ ور ہوں، کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ یک جا کر دیں، جنہیں دینی علوم میں مہارت حاصل ہو۔ جن میں اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیت پائی جاتی ہو اور جو اپنا وقت دینِ اسلام کی خدمت میں لگانے کو تیار ہوں اور ہم ان لوگوں کے لیے نئی تہذیب اور جدید تمدن کے شور و شغب سے دور ایک دارالاقامت بنا دیں۔ جو ان کے لیے ایک اسلامی علمی مرکز کا کام دے۔ اور اس میں ہم ان کے لیے ایک لائبریری ترتیب دیں، جس میں وہ تمام قدیم و جدید کتابیں موجود ہوں جن کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ مزید برآں ان کے لیے ایک کامل اور صالح گائیڈ کا تقرر کیا جائے، جسے قرآن حکیم پر بصیرتِ تامہ حاصل ہو اور جو دنیائے جدید کے احوال و حوادث سے بھی باخبر ہو، تاکہ وہ ان لوگوں کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ کی روح سمجھا سکے اور فلسفہ و حکمت اور اقتصادیات و سیاسیات کے شعبوں میں فکرِ اسلامی کی تجدید کے سلسلے میں انہیں مدد دے سکے، تاکہ یہ لوگ اپنے علم اور اپنے قلم سے اسلامی تمدن کے احیا کے لیے کوشاں ہوسکیں۔

''آپ جیسے فاضل شخص کے سامنے اس تجویز کی اہمیت واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، چنانچہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ازراہِ کرم ایک روشن دماغ مصری عالم کو

جامعہ ازہر کے خرچ پر بھجوانے کا بندوبست فرمائیں، تاکہ وہ اس کام میں ہمیں مدد دے سکے۔ لازم ہے کہ یہ شخص علومِ شرعیہ، نیز تاریخ تمدنِ اسلامی میں کامل دستگاہ رکھتا ہوں اور یہ بھی لازم ہے کہ اسے انگریزی زبان پر قدرت حاصل ہو۔''(۳۹)۔

اس کے جواب میں شیخ الازہر نے لکھا ہے کہ''ہمارے ہاں علمائے ازہر میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں، جو انگریزی زبان پر قدرت رکھتا ہو''۔(۴۰) سید نذیر نیازی اور میاں محمد شفیع کہتے ہیں کہ علامہ کی نظر سے مولانا مودودی کی تحریریں گزری تھیں اور ان کی کتاب الجہاد فی الاسلام بھی علامہ نے دیکھی تھی، چنانچہ وہ ان کی علمیت اور ان کے فہم اسلام سے متاثر تھے۔ انہوں نے چودھری نیاز علی کو مشورہ دیا کہ وہ مولانا مودودی کو حیدر آباد سے دارالسلام بلالیں۔ چودھری نیاز علی خان کہتے ہیں کہ''حضرت علامہ کی نظر جوہر شناس بھی سید صاحب پر جا پڑی''۔(۴۱)۔مختصر یہ کہ مولانا مودودی نے لاہور آکر، چودھری نیاز علی خان اور علامہ محمد اسد کی معیت میں علامہ اقبال سے ملاقات کی اور مجوزہ ادارے کے آئندہ منصوبوں، منہاج اور طریقہ کار وغیرہ کے بارے میں تفصیلی گفتگو کے بعد، مارچ ۱۹۳۸ء میں حیدر آباد دکن سے جمال پور، پٹھان کوٹ منتقل ہو گئے۔ علامہ کا ارادہ تھا کہ وہ بھی ہر سال، چند ماہ کے لیے وہاں آکر قیام کریں گے۔ مولانا مودودی مزید مشوروں اور رہنمائی کے لیے لاہور جانے کا پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ سید نذیر نیازی کا خط موصول ہوا، جس میں نیازی صاحب نے انہیں لکھا:''جس قدر جلد ممکن ہو، لاہور آیئے، کیونکہ علامہ اقبال کی حالت اچھی نہیں ہے۔''اس خط کے تیسرے روز علامہ اقبال عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے۔(۴۲)۔یوں ایک اسلامی تحقیقی ادارے کا جو خواب اقبال نے دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔۴۳،۴۴

☆☆☆☆☆

حوالے اور حواشی:

۱۔ اقبال درون خانہ (اول) مرتب: خالد نظیر صوفی، بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۸۔۹

۲۔ زندہ رود، جاوید اقبال۔ سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۴ء، ص۔۸۳

۳۔ اس کی تفصیل ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کی مرتبہ کتاب روایاتِ اقبال (مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۷ء)

میں ملتی ہے، جس میں مولوی میر حسن کے شاگردوں کے بیانات یکجا کیے گئے ہیں۔

۴۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، ص ۸۴

۵۔ عروج اقبال، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، بزم اقبال لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۴۳۔۴۴

۶۔ دیباچہ: بانگ درا، علامہ محمد اقبال۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۱۱

۷۔ ذکر اقبال، عبدالمجید سالک۔ بزم اقبال لاہور، ۱۹۵۵ء، ص ۱۷۔ عروج اقبال، ص ۵۰

۸۔ دمادم رواں ہے یم زندگی، خرم علی شفیق، الحمد ا، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء۔

۹۔ عروج اقبال، ص ۱۰۴۔ مطالعے میں اقبال کے استغراق کی یہ کیفیت، ہمیں انگلستان جاتے ہوئے بحری جہاز کے عرشے پر مطالعہ کتاب میں آرنلڈ کی محویت کی یاد دلاتی ہے۔ اس کا ذکر ان کے ہمسفر شبلی نعمانی نے سفر نامہ مصر و روم و شام میں کیا ہے۔

۱۰۔ اورینٹل کالج کے زمانۂ معلمی کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: ۱۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا مضمون ''اقبال کی تعلیمی زندگی کے کچھ تفصیلات'' اورکلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ)۔ ۲۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا مضمون: اقبال، اورینٹل کالج میں، در مطالعہ اقبال)۔ ۳۔ ڈاکٹر محمد باقر کا انگریزی مضمون: شیخ محمد اقبال: امیکوڈ عربک ریڈر ایٹ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور، در: احوال وآثار اقبال، دوم: ص ۱۔۱۲۔

۱۱۔ بانگ درا، ص ۷۷

۱۲۔ نوادر اقبال، یورپ میں، ڈاکٹر سعید اختر درانی، اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۶

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ رحیم بخش شاہین: ''اقبال کا ذخیرۂ کتب'' مشمولہ ارمغان اقبال، رحیم بخش شاہین، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۲۶۶۔۲۶۸۔ اقبال کولیکشن پر شاہین مرحوم کے اس مضمون کے علاوہ سیف اللہ خالد کا مضمون (فاران، لاہور) اور چودھری محمد صدیق کی مرتبہ توضیحی فہرست Descriptive Catalogue of Allama Iqbal's Books (اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۸۳ء) کا مطالعہ مفید رہے گا۔

۱۵۔ مجالس اقبال، ص ۱۳۵۔

۱۶۔ اقبال نامہ، مرتب: شیخ عطاء اللہ۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۵۰

۱۷۔ چودھری محمد حسین اور علامہ اقبال، ثاقف نفیس، شعبہ اردو، اورینٹل کالج لاہور، ۱۹۸۱ء، غیر مطبوعہ تحقیقی مقابلہ، ص ۴۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۹۔ علی الترتیب: ملفوظات، مرتب: محمود نظامی، لاہور، ص ۲۲۶: ذکر اقبال، ص ۲۱۲، اقبال، بھوپال میں، عبدالقوی دسنوی، بھوپال ص ۱۴

۲۰۔ دیکھیے علی الترتیب: انوار اقبال، مرتب: بشیر احمد ڈار، اقبال اکادمی پاکستان، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۲۰۵۔ ۲۰۶، اقبال نامہ، ص ۲۷۰، ۲۷۳، مکتوبات، اقبال۔ مرتب نذیر نیازی اقبال اکادمی، پاکستان، ۱۹۵۷ء، ص ۲۷۷، ملفوظات، ص ۲۲۶

۲۱۔ ملفوظات، ص ۲۲۷

۲۲۔ اقبال نامہ، ص ۲۷۳

۲۳۔ مکتوبات، اقبال، ص ۳۲۴

۲۴۔ اقبال نامہ، ص ۹۸

۲۵۔ اقبال نامہ، ص ۱۵۵

۲۶۔ اقبال بنام شاد، مرتب: محمد عبداللہ قریشی، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۲۲۷

۲۷۔ Letters & Writings of Iqbal مرتب: بشیر احمد ڈار، اقبال اکادمی پاکستان، کراچی، ۱۹۶۷ء

۲۸۔ اقبال نامہ، ص ۱۱۰۔ ۱۱۱، ۱۵۵۔ ۱۵۶، حیاتِ انور، ص ۱۶۵

۲۹۔ اقبال نامہ، اول، مرتب: شیخ عطاء اللہ، شیخ محمد اشرف لاہور، ۱۹۴۴ء، ص ۵۴

۳۰۔ تاریخ تصوف کے نام سے صابر کلوروی کی مرتبہ کتاب اسی سلسلے کی ناتمام تحریروں اور اشارات وشذرات (notes) کا مجموعہ ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: نقوش، اقبال نمبر دوم، دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۱۵۶۔ ۱۵۸۔

۳۱۔ بحوالہ نقوش، محولہ بالا، ص ۱۵۶

۳۲۔ مجالس اقبال، مرتب: جعفر بلرج، دارالتذکیر لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۳۹۔ ۱۴۰

۳۳۔ مجالس اقبال، ص ۱۴۱

۳۴۔ ذکر اقبال، ص ۲۱۳

۳۵۔ اقبال نامہ، ص ۵۲۲

۳۶۔ سرگذشتِ اقبال، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۵۲۶۔ حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، مرتب: محمد حمزہ فاروقی، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۵۳۱

۳۷۔ زندہ رود، ص ۶۶

۳۸۔ چودھری نیاز علی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خط کتابت کے لیے دیکھیے: سید اسعد گیلانی کی تصنیف: اقبال، دارالاسلام اور مودودی، اسلامی اکادمی لاہور، ۱۹۷۸ء

۳۹۔ خطوطِ مودودی، دوم، مرتبین: رفیع الدین ہاشمی، سلیم منصور خالد، منشورات لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۶۰

۴۰۔ خطوطِ اقبال، مرتب: رفیع الدین ہاشمی، مکتبہ خیابانِ ادب لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۲۸۴، ۲۸۶۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۲۸۸

۴۲۔ صحیفہ، اقبال نمبر حصہ اول، مدیر: ڈاکٹر وحید قریشی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۲۳۰۔

۴۳۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے: مولانا مودودی کے خطوط بنام چودھری نیاز علی خان اور سید نذیر نیازی، مشمولہ: خطوطِ مودودی، دوم۔

۴۴۔ مولانا مودودی اور ان کے رفقا اگست ۱۹۴۷ء تک جمال پور، پٹھان کوٹ میں مقیم رہے اور علامہ اقبال ہی کے خواب (ملتِ اسلامیہ کی حیاتِ نو) کی تکمیل کے لیے اپنی دانست اور فہم کے مطابق کوشاں رہے۔ قیام پاکستان کے بعد، اس ضمن میں کچھ اور علمی اداروں نے بھی قابل قدر خدمات انجام دیں، جیسے اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، نظریاتی کونسل، اسلام آباد وغیرہ۔

☆☆☆

پروفیسر عبدالحق
سابق صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

اقبال کا تصور جہاد

اقبال کی پہچان کا وسیلہ 'خودی' ہے۔ اسی سے ان کے تمام تصورات روشن ہوتے ہیں اور یہی رودِ رواں بن کر ان کے حرف وصوت کی روح میں جاری ہے۔ ان کے نزدیک ہر ذرہ کائنات اس کی موجودگی سے منور اور متحرک ہے۔ خودی شعوری احساس یا ادراک کا نام ہے، جو بذاتِ خود پوشیدہ ہے مگر اپنے عمل کی رو سے مرئی یا مادی صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ جدوجہد اس کے سرچشمہ قوت کا ایک ادنیٰ مظہر ہے اور ممنون بھی۔ خودی کا مقصود تعمیر و تخلیق ہے، جو تاب کار قوت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی سے خودی لافانی بنتی ہے۔ اقبال کے نزدیک تخلیق کی تکمیل اور تزئین کے لئے جدوجہد کا نتائج سے بے نیاز ہو کر مسلسل جاری رہنا جہاد ہے۔ یہ صف آرائی و کشور کشائی یا مالِ غنیمت پر منحصر نہیں ہے۔ مقصد کا حصول بھی نہیں ہے۔ 'طلوع اسلام' کا بے حد مقبول شعر جہاد کی ہمہ گیر اور بے پناہ وسعتوں و امکانات کی طرف ہر نقطۂ نگاہ کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔

یقیں محکم عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

گویا زندگی خود ایک عرصہ کارزار ہے۔ جس میں فتح و شکست کے متعدد مرحلوں سے گذرتے رہنا قانونِ فطرت ہے۔ کارگہ حیات میں ہر لحہ صلیب و دار کی آزمائش کا مطالبہ کرتا رہتا ہے۔ انسان کا مظاہر فطرت کے ساتھ اپنے اندرونِ وجود سے نبرد آزما ہوتے رہنا اور اس کی خاک و خمیر کا اہم عنصر ہے۔ یہی پیکارِ زندگی ہے۔ اس عمل پیہم سے ہر شئے کی حیات عبارت ہے۔

در عمل پوشیدہ مضمون حیات
لذتِ تخلیق قانونِ حیات

یا

زندگانی قوتِ پیدا ستے

یا

زندگی کشت است و حاصل قوت است

فیضانِ قوت کے بغیر وجود یا خارجی مظاہر کی تسخیر ممکن نہیں ہے۔ تسخیر فطرت فکرِ اقبال میں ایک اہم ترین نکتہ ہے۔ اسی قوتِ تسخیر سے بالائے افلاک، سطح زمین اور سیاروں کا عالم امکان غرض سبھی بشریت کی زد میں رہتے ہیں۔ یہی قوت شب کی سیاہ راتوں میں قندیل روشن کرتی ہے۔ یہی مسجد قرطبہ اور اہرام مصر کی تخلیق کے ساتھ شرکی قوتوں کو شکست دے کر انہیں شرمسار بھی کرتی ہے۔ اس کے لئے آلاتِ حرب وضرب کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہاں خون ریزی وخوں بہا دونوں ممنوع اور مسترد ہیں اس میں نہ جیت ہے نہ ہار۔ یہاں غازی اور غلام کے امتیازات معدوم ہو جاتے ہیں:

شہیدِ محبت نہ کافر نہ غازی
محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی

پیاسوں کو پانی پلانا بھی جہاد کے زمرے میں شامل ہے۔ نظم فاطمہ بنت عبداللہ کا شعر ملاحظہ فرمائیں:

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

یہ لذتِ گریہ نہیں بلکہ لذتِ آشنائی ہے جو دلوں کو دونوں عالم کے عیش فراواں سے بے گانہ بنا دیتی ہے۔ آرزوئے حیات کی تکمیل کے لئے عمل پیہم جہاد کی ایک مستحسن صورت ہے اور ضرورت بھی۔ مقاصد صالح اور صحت بخش ہوں تو ہر عمل بقائے بشریت کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو قبائے انسانی کی آبرو تار تار ہوتی ہے۔ نشۂ قوت کی قیامت خیز ہلاکت سے کرۂ ارض بارہا خوں ریز ہوا ہے۔ 'ضربِ کلیم' کی مختصر مگر موثرات سے معمور نظم کے اشعار آپ کی یادداشت میں

محفوظ ہوں گے۔ اقبال نے بے باکی کے ساتھ دوٹوک لفظوں میں تصورِ جہاد کو تاریخ و تفکر کی ایک بڑی حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے:

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

'مثنوی مسافر' میں اسی خیال کو دوسرے پیرایۂ بیان میں پیش کیا گیا ہے۔ یعنی قوموں کے لئے عظیم اخلاقی اقدار کی پابندیاں لازمی ہیں ورنہ جلال و جبروت قابل نفرت ہے۔

امتاں را لا جلال الا جمال

یا

قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

عقل سلیم کی پابندی کے بغیر جہالت اور جنون کی بھیانک صورت اختیار کر لیتی ہے اور فسطائیت یا آمریت فسادِ خلق برپا کرتی ہے۔ قوت کو خیر کثیر کا منبع ہونا چاہئے۔ جوشر کی سرنگوں اور صحت مند معاشرے کی تعمیر میں پوری تن دہی کا مظاہرہ کر سکے۔ شمشیر سکندر کا طلوع اور انسانیت کے تہ تیغ ہونے کی بہت سی مثالیں ہمارے مشاہدے میں ہیں۔ اس سے نجات قوتِ خیر کثیر سے ہی ممکن ہے۔ دست قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق بھی بیدار عزائم کی مرہونِ منت ہوتی ہے اور عزائم کا انصرام قوتِ جسم و جان کے تابع ہے۔ ناتواں بازوؤں سے بغاوت اور بیداری نہیں پیدا ہوتی۔ یہ قاطع حیات اور راہ زن بن جاتی ہے۔

ناتوانی زندگی را رہ زنی است

اقبال کا یہ مصرع ضرب المثل کی حیثیت سے معروف ہے۔

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

حیات آفرینی اور اس کے استحکام کے لئے تاب و تپش سے دوچار رہنا عین فطرت ہے۔

اقبال نے علامت کے طور پر شاہین کو پسند کیا ہے۔ جس پر اعتراضات بھی ہوئے ہیں۔ یہ خیال پیش نگاہ رہے کہ یہ علامت ہے اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مطلوب وہ طاقت ہے جو شاہین سے قطع نظر کم ترین پرندوں میں بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ فاختہ اور ممولہ یا کنجشک فرومایہ بھی شاہین کا حریف بن سکتا ہے۔ لہو گرم ہو تو فاختہ شاہینی صفات کا حامل بن سکتا ہے۔

زندگی سوز و ساز بہ ز سکونِ دوام
فاختہ شاہیں شود از تپشِ زیرِ دام

اقبال اس کبوتر کو آفریں کہتے ہیں جو اپنے تن نازک میں ناقابل تسخیر توانائی پیدا کر کے شہباز و شاہین کو شکست دیتا ہے۔

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

یقیں و عمل کے سوز و ساز سے ہر بے مایہ کی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے۔ یہ صرف لذت پرواز پر موقوف ہے۔ شاہین اگر کرگسوں میں پلا ہو یا زاغ و زغن کی صحبتوں کا پروردہ ہو تو قابل نفرت ہے۔ اور اگر خودی صورتِ فولاد مستحکم ہو تو کائنات کا ہر ذرہ مہر و ماہ کو تاراج کرنے کے لئے کافی ہے۔ درّاج کے سینے میں نفس گرم پیدا کر کے اقبال یارانِ چمن کو معرکۂ باز کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔ یہ بھی ترغیب جہاد کی ایک صورت ہے۔ 'پیام مشرق' کی نظم 'شاہین و ماہی' میں بچہ ماہی شاہین کو للکارتا ہے:

ہر لحظہ جوان است و روان است و دواں است
از گردشِ ایام نہ افزوں شد و نے کاست

'ساقی نامہ' کا یہ شعر بھی توجہ طلب ہے:

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

نظم 'فرمانِ خدا' کا یہ اساسی پہلو پیش نظر رکھیے۔ اس کی معنویت کچھ اور کہتی ہے۔

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

جنگ و جہاد کے یہ تصورات اقبال کی وسعتِ فکر کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو عہد اقبال کا سب سے اہم مطالبہ تھا۔ مغربی آقاؤں کی غلامی کے خلاف اور آزادی کی بحالی کے لیے لہو کو حرکت و حرارت میں لانے کے لئے اس نقطۂ جہاد کی ضرورت تھی جو مغرب کی چیرہ دستیوں کا خاتمہ بزور قوت کر سکے۔ گویا غلام قوم کو آزادی کے حصول کے لئے برسرِ پیکار رہنا بھی جہاد ہے۔ ''ضربِ کلیم'' کے ابتدائی اشعار میں اقبال اپنے ناظرین سے توقع کرتے ہیں کہ وہ زجاج کو حریف سنگ بنادیں۔ یہ زور دست اور ضربت کاری کی آزمائش ہے فطرت لہو ترنگ ہے۔ دل و جگر کی خوں ریزی سے ہی سرمایہ حیات کی حفاظت ممکن ہے۔ کفن بردوش ہو کر طاغوتی طاقتوں کے خاتمے کے لئے جہاد سے بڑھ کر کوئی اور شے نہیں ہے جسے جان و تن سے بھی زیادہ عزیز قرار دیا جا سکے۔ بلند عزائم سے ہی توپ و تفنگ کو خاموش کیا جا سکتا ہے۔ دلوں میں یہ جذبہ موجزن ہو تو ہر نگاہ آب دار تلوار کی دھار بن کر گزرتی ہے۔

اقبال نے زمین و زر کی خاطر جنگ کو کاروانِ نوعِ انسان کا رہزن قرار دیا ہے جو تسخیر کے نام پر تاراجگی کا باعث ہے۔ اس سے انسانوں کی بستی آتش فشاں بن جاتی ہے۔ جابر طاقتوں کی یہ شمشیر بے نیام ملک و ملت کی ہلاکت کا موجب بنتی ہے۔ ایسی صورت میں چارہ سازی کیسے ممکن ہو۔ بالِ جبریل کی طویل مکالماتی نظم سے رجوع کرتے ہیں۔ مرید ہندی کا سوال ملاحظہ ہو:

اے نگہ تیری مرے دل کی کشاد
کھول مجھ پر نکتۂ حکم جہاد

پیر رومی کے حکیمانہ جواب بھی ملاحظہ ہو:

نقشِ حق را ہم بامر حق شکن
بر زجاجِ دوست سنگ دوست زن

کسی پیش رفت کے بغیر ضربِ شاہی کے سنگین آلات کو انہیں کے شیش محلوں کی طرف لوٹا دینا ہی جہاد ہے۔ قرآن کریم کی وہ آیت کریمہ یاد آتی ہے جس میں دانت کے بدلے دانت اور زخم کے بدلے زخم سے تجاوز نہ کرنے کی سخت تاکید کی ہے۔ اقدار کی حفاظت کے ساتھ جان و تن کے تحفظ کے لئے یہ ناگزیر ہے۔ انتقام یا استبداد کے اظہار کے لئے نہیں۔

سیر و مغازی کی کتابوں میں جہاد کی بہت سی قسموں کا تذکرہ ہے۔ یہ ہر جگہ شمشیر و سناں کا

محتاج نہیں ہوتا۔ جیسے قلم کا، زبان کا، طاقت کا، محسوسات کا، نفس کا وغیرہ۔ یہ سب برائی کے خلاف یا منکرات کے سدباب کے لئے ہیں۔ جو مثالی معاشرے کے استحکام کے لئے لازمۂ حیات ہیں۔

اقبال کے ان تصورات کو برصغیر کی غلامی سے الگ کر کے دیکھنا غیر مفید اور گمراہ کن ہوگا۔ تحریک آزادی میں جاں بازی اور جاں سپاری کا خروشِ احساس پیدا کرنے اور مغربی جبر و ظلم کے خاتمے کے لئے یہی نسخۂ شفا تھا۔ رشی کے فاقوں سے برطانوی طلسم کا ٹوٹنا ممکن نہ تھا۔ اقبال کے عزم و یقیں میں 'عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد' کا تصور تکوینی نظام کا حامل ہے اور حاصل بھی۔

اقبال اس سے پہلے ایشیائی انگڑائی کو لبیک کہہ چکے تھے۔

زمیں جولاں گہ اطلس قبایانِ تتاری ہے

اب ہندوستان کے مغربی آقاؤں کے خلاف انقلابی آواز کی ضرورت تھی:

فریاد ز افرنگ و دلاویزیٔ افرنگ

اور

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ

کے لئے جہاد کے پیغام کی ضرورت تھی جس سے وطن کی حرمت و حرارت بحال کی جا سکتی تھی۔ ان مقدمات کے بعد اب اس کلیدی نقطے کی طرف آئیے جو ان کے تصورِ جہاد کی تعبیر نہیں بلکہ تکمیل ہے۔

اسرارِ خودی کا یہ باب ''جہاد اگر محرّکِ اُو جوع الارض باشد در مذہب اسلام حرام است'' بہت ہی فکر انگیز ہے۔ اس عنوان کے آخر میں تین اشعار ملاحظہ ہوں:

عسکرِ شاہی و افواجِ غنیم
ہر دواز شمشیرِ جوعِ اُو دونیم
آتشِ جانِ گدا جوعِ گداست
جوعِ سلطاں ملک و ملت را فناست
ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید
تیغ اُو در سینۂ اُو آرمید

ملک و مال یا زر و سیم کی ہوس رانی جہاد نہیں ہے یہ شر سے دفاع، قیامِ امن، آزادی و آشتی

کے لئے ضروری ہے۔

ایک اور اہم بات بھی پیش نظر رکھیے کہ اقبال کے تصورات میں جہاد کا مقصد صرف انسانوں کے خلاف نبرد آزما نہیں ہے۔ بلکہ خارجی مظاہر میں خود فطرت کیخلاف بھی یہ عمل جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ بیرونی وجود میں اگر مزاحمتوں کا سامنا ہو تو انہیں خاکستر کر کے نئی دنیا آباد کرنے کی تاکید ہے۔ ارض وسما کو پھونک ڈالنے کی بات اقبال نے ہی کہی ہے۔ اگر جہان کاخ و کو راس نہ آئے تو اسے بھی درہم برہم کر دیا جائے۔ اسرارِ خودی میں بڑی بلاغت اور بانگ دہل کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے:

گر نہ سازد با مزاجِ اُو جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را
میدہد ترکیبِ نو ذرات را
گردشِ ایام را برہم زند
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست
ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید
تیغِ اُو در سینۂ او آرمید

الماس وزغال کی حکایت کا ماحصل یہی ہے کہ پیکار زندگی سے ہی پختگی حاصل ہوتی ہے۔ کوئلے کی کان میں رہ کر مسلسل جنگ آزمائی سے ہی الماس کا جمال بے مثال شہنشاہوں کے تاج کی زینت بنتا ہے۔

در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی، ناکسی ناپختگی است

اقبال کے نزدیک یہ صلابت جنگ وجہاد سے زیادہ زندگی کے مہمات کو سر کرنے کے لئے ضروری ہے۔ ناتوانی و ناکسی سب مرگِ حیات ہیں۔ ایسے مردہ وافسردہ افراد سے ہر طرح کی جنگ وجہاد اقبال کے نزدیک حرام ہے۔ اس فکر کی بلندی و برنائی کو دیکھیے۔ مصرع کی معنویت بھی ملاحظہ ہو:

کے سزد با مردہ غازی را جہاد

یہ حکیمانہ نقطۂ نظر جاوید نامہ میں عارفِ ہندی یا وشوامتر کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔ ابھی راقم نے عرض کیا تھا کہ اقبال خود اپنے اندرونِ وجود سے آویزش کی تلقین کرتے ہیں اور یہ جہاد کی منزل اولین قرار پاتی ہے۔ عارفِ ہندی کے نو ارشادات میں پانچواں نکتہ اسی امر کی وضاحت میں ہے:

مردِ مومن زندہ و باخود بجنگ
برخود افتد ہمچو بر آہو پلنگ

اقبال کے وسیع تر تصورات کا یہ پہلو ان کی اجتہادی فکر کا سب سے روشن ورق ہے۔ یہ جنگ شعلہ سوزاں سے فوج و سپاہ کے بغیر لڑی جاتی ہے۔ فلکِ زہرہ کی یہ آسمانی آواز سنیے:

اندرونم جنگ بے خیل و سپہ
بیند آں کو ہم چو من دارد نگہ

انسانی سرشت میں سرایت کی ہوئی شر یا شیطانی قوتوں کو شکست دینے کے لئے یہ جنگ ضروری ہے۔ وجود کی اسی بے لگام آمریت نے مفسدانہ قوتوں کے سہارے دنیا میں فتنہ و فساد برپا کر کے انسانی بستیوں کو بارہا نذر دوزخ کیا ہے۔

جنگِ شاہانِ جہاں غارت گری است
جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است

یہ غزوات بنی نوع بشر کی بقا اور خیر کثیر کے فروغ کے لئے جائز قرار دیئے گئے ہیں۔ جس میں انسان کے ساتھ بے زبان چوپایوں، کشت دہقاں اور باغ وراغ کو تحفظ بخشنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ یہ جہاد دوستی و دردمندی کو خوش آمدید کہنے کے لئے ہے۔ یہ ترکِ دنیا کر کے دوست کے کوچے کی طرف گامزن ہونے کا نام ہے۔ اقوامِ عالم کے لئے اس حرف شوق کا پیغام عام کرنے کی ضرورت پر اقبال نے زور دیا ہے۔

آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت
جنگ را رہبانی اسلام گفت

اقبال کی افسردگی شکوہ سنجی میں بدل جاتی ہے کہ جہاد کی روح سے بیگانگی نے گمراہی پھیلائی ہے۔

آں زایراں بود و ایں ہندی نژاد
آن ز حج بے گانہ و ایں از جہاد

جہاد سے منسوب کذب و افترا سے بھرپور تعبیرات کا ایک ہیجان ہے۔ غلط اور گمراہ کن تاویلات کے لیے بڑی بڑی جماعتیں ہمیشہ سرگرم کار ہیں۔ آج کا منظر نامہ کچھ اور ہی ہے۔ مغرب کی استعماری طاقتوں کے عالم گیر اشتہار نے عام ذہن میں پراگندگی کی خباثت سرایت کردی ہے۔ ایران حج سے بے گانہ اور ہندی باشندے جہاد کی معنویت سے بے بہرہ ہیں۔ اقبال کو شکوہ ہے کہ فرزانے بھی ذہنی کج روی میں غوطے لگا رہے ہیں۔ اقبال کے تصورات کی تفہیم کے لئے عقل رسا اور وسعت نظر کی ضرورت ہے۔ انہوں نے ایک انتہائی خیال افروز اور آفاقی پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے جس کی مثال دنیائے دانش میں نہیں ملتی۔

منکرِ حق نزد ملا کافر است
منکر خود نزد من کافر تر است
شیوۂ اخلاص را محکم بگیر
پاک شو از خوفِ سلطان و امیر
عدل در قہر و رضا از کف مدہ
قصد در فقر و غنا از کف مدہ

یعنی منکر وجودِ حق سے قبل اپنے وجود یا خودی کی نفی کرنے والے سے جہاد کا جواز اقبال نے پیدا کیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر شعورِ ذات یا عظمت آدم سے انکار نا قابل برداشت ہے۔ منصفی اور معتدل مزاجی کا تقاضا ہے کہ جنگ و جدال کے وقت شیرانِ غاب سے زیادہ جری اور صالح و آشتی کے لمحوں میں رعنا غزال تاتاری کا حسن سلوک پیش کیا جائے۔ کوہ و بیاباں میں سیل بے اماں اور چمن زاروں یا گزرگاہوں میں جوئے نغمہ خواں بن جانے کی بشارت اقبال نے ہی دی ہے۔ یہ جہاد جارحانہ نہیں مدافعانہ ہے۔ امنِ عالم کی بحالی اور صلح و آشتی کے لئے سراپا نیاز مند ہونا ہی جہاد ہے۔ ہر حال میں شیوۂ اخلاص کو پیش نظر رکھنے پر انہوں نے زور دیا ہے۔

اسی سلسلے کے ان اشعار میں اقبال کی دل سوزی و دردمندی ملاحظہ فرمائیں:

حرفِ بد را بر لب آوردن خطا است

کافر و مومن ہمہ خلق خدا است
آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقام آدمی
آدمی از ربط و ضبط تن بہ تن
بر طریق دوستی گامے بزن

اقبال کے مرتب کردہ دوستی کے اس منشور پر نظر ڈالیے جس میں ہر انسان کو شانے سے شانہ اور قدم سے قدم ملا کر دوستی کی راہ پر گامزن ہونے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ من وتو کی تفریق سے باز رہنے، تمام انسانوں کی خلق خدا کے مضبوط رشتے میں بندھے رہنے اور جمیت آدم کے نصب العین کو حاصل کرنے کی تلقین ہے۔ اسے یاد رکھیے کہ اقبال نے ہی جمیت آدم کی اصطلاح سازی کی ہے۔ جو نظریہ یا عمل اس کو زد پہنچائے وہ مذموم ہے۔ اس کے خلاف اعلان جہاد کر کے اسے صفحہ ہستی سے نابود کر دیا جائے۔ اسی لیے اقبال نے جمیت اقوام کی تنقید کی ہے۔ اقبال کو انسانوں سے پیار کرنے والے فلسفوں اور انسانوں کی بڑی آرزو رہی ہے۔ 'اسرار خودی' کی ابتدا ایسے ہی انسان کی تلاش سے ہوئی تھی اور فکر کی انتہاؤں میں بھی ان کی یہی خواہش انہیں مضطرب کرتی رہی۔ وہ انسان امن عالم کا محافظ، اقدار کی عظمتوں کا نگہبان، جلال و جمال کا پیکر، آمرانہ طاقتوں کے خلاف جدو جہد کر کے دست قضا میں صورت شمشیر بن کر نمودار ہوگا۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو در سوادِ دیدہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن نغمۂ خود را بہشت گوش کن
باز در عالم بیار ایامِ صلح جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح

☆☆☆

ڈاکٹر طارق احمد مسعودی
شعبۂ ایجوکیشن
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد

جگن ناتھ آزاد کی نعتیہ شاعری فکرِ اقبال کے آئینے میں

علامہ اقبال جس فلسفۂ زندگی کے داعی رہے ہیں، پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اس کی ترسیل و ابلاغ میں اپنی پوری عمر صرف کی۔ اقبالیاتی ادب کے تعلق سے پروفیسر آزاد کی ادبی شخصیت بین الاقوامی شہرت کی حامل تھی۔ اقبال کے نظام فکر میں ہم جن خصوصیات، اقدار اور عناصر کا مشاہدہ کرتے ہیں، آزاد صاحب کی فکر وفہم ان ہی سے عبارت تھی۔ خواجہ غلام السیدین، جگن ناتھ آزاد کی شخصیت پر افکارِ اقبال کے اثرات کا تجزیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''آزاد کے کلام پر اقبال کا بہت اثر ہے، جس کا اس نے ہر مقام پر بہت فخر کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ اس نے اقبال کے کلام سے اندازِ فکر اور انداز بیان لیا ہے موضوع لئے ہیں، فکر کے سانچے اور زبان کی آب وتاب لی ہے۔ مرید ہندی اور پیر رومی کے انداز میں اقبال سے گفتگو کی ہے اور اس کے مزار پر جا کر نہ صرف خراجِ عقیدت پیش کیا ہے بلکہ دل میں جو سوال کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے، ان کا جواب طلب ہے۔ اقبال کے ایک شعر میں خفیف سا تصرف کر کے آزاد نے ان سے اپنا فکری رشتہ یوں استوار کیا ہے۔

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہوں میں
مرے لئے ہے تیرا شعلہ نوا قندیل

ظاہر ہے اقبال اور اقبالیات جگن ناتھ آزاد کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ بلاشبہ تقسیم کے بعد ہندوستان میں انہوں نے ایک دیدہ ور کی طرح تفہیم اقبالیات کی تحریک میں میر کارواں کا رول ادا کیا۔ ان کا ادبی شعور دراصل دبستانِ اقبال میں ہی پرورش پا گیا تھا۔ پروفیسر نیر مسعود نے

درست لکھا ہے۔

''اقبال جگن ناتھ آزاد کا پہلا (اور شاید واحد) عشق ہے جس میں وہ اپنا ادبی شعور پیدا ہوتے ہی گرفتار ہو گئے تھے۔''

پروفیسر آزاد نے خود علامہ اقبال سے فیض یاب ہونے کا اعتراف فکر کی گہرائیوں میں اتر کر جا بجا کیا ہے۔

لبریز حقیقت ہے پیامِ اقبالؔ
الہام ہے الہام کلام اقبالؔ
دلکش نغمات میں کتنی کشش ہے
آزاد ہوا اسیر دامِ اقبال

پروفیسر آزاد اقبال سے نہ صرف متاثر تھے، بلکہ ان کے عاشق بھی تھے۔ علامہ اقبال سے اپنی وارفتگی کو آزاد نے دردِ جگر کی وجدانی کیفیت میں پرو کر یوں نذرِ اقبال کیا ہے۔

منزل جاناں کو جب یہ دل رواں تھا دوستو
تم کو میں کیسے بتاؤں کیا سماں تھا دوستو
دل کی ہر دھڑکن مکان و لا مکاں پر تھی محیط
ہر نفس راز دو عالم کا نشاں تھا دوستو
مرقدِ اقبال پر حاضر تھی جب دل کی تڑپ
زندگی کا ایک پردہ درمیاں تھا دوستو
بے خودی میں جب مرے ہونٹوں نے چوما قبر کو
مرا سینہ سجدہ گاہِ قدسیاں تھا دوستو
سو رہا تھا خاک کے نیچے جہانِ زندگی
راز عالم میری نظروں میں عیاں تھا دوستو
کاش تم بھی میری پلکوں کا نظارہ دیکھتے
یہ نظارہ کہکشاں در کہکشاں تھا دوستو

درد و سوز، وسیع المشربی اور فطری احساسات سے پُر ان کی شاعری نے اردو دنیا کے

لاتعداد شائقین کو ان کا گرویدہ بنادیا۔ ان کی ایک نظم سے متاثر ہوکر معروف شاعر، صحافی اور نقاد مولانا عبدالمجید سالک نے کہا تھا:

''جگن ناتھ آزاد کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت درد واثر ہے جو خلوص احساس کے بغیر ہرگز پیدا نہیں ہوسکتا۔ زبان کی گھلاوٹ، بیان کی سلاست اور حقیقت بینی نے اس کو برصغیر ہندو پاک کی صف اول میں جگہ دی ہے اور بلاشبہ وہ اس مقام کا مستحق ہے۔''

پروفیسر آزاد کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے گھریلو ماحول اور خاص کر ان کے والد گرامی پنڈت تلوک چند محروم کا بھی اہم ہاتھ رہا ہے۔ تلوک چند محروم نہ صرف ایک بڑے شاعر تھے بلکہ علامہ اقبال کے دوست بھی تھے علامہ انہیں قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ایک مفکر تعلیم کی حقیقت سے اقبال نے بعض علمی شخصیات کے تعاون سے ساتویں تا دسویں جماعت کے طلباء کے لئے فعال کتابیں تیار کیں، ساتویں جماعت کے لئے اردو کتاب جس کا عنوان ''اردو کورس'' رکھا گیا تھا، میں علامہ اقبال نے دیگر ادبی شخصیات کی نگارشات کے علاوہ محرومؔ کی ایک نظم ''اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے'' کو اس نصابی کتاب میں شامل کیا۔ نظم کے چند اشعار اس طرح ہیں ؎

زندہ نہیں رہے گا آخر کبھی مرے گا
مرنے کے بعد اپنے پھر کچھ نہ کرسکے گا
پوچھیں گے جب فرشتے تو کیا جواب دے گا
اس وقت دست حسرت افسوس سے ملے گا
جو کچھ ہو کام کرنا، دنیا ہی میں کئے جا
اس ہاتھ سے دئے جا اس ہاتھ سے لئے جا

علامہ اقبال کے فکری مآخذ میں دین اسلام کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ فی الحقیقت انہوں نے ساری روشنی اور گرمی اسی سرچشمے سے حاصل کی ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''قرآن اور رسولؐ سے اقبال کی محبت عشق کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی اور اس محبت نے اقبال کے دل پر یہ حقیقت روشن کی کہ یہ ساری کائنات ایک خدا کی مخلوق ہے اور اس میں ہر شخص کے ساتھ پیار اور محبت سے پیش آنا چاہئے۔ چنانچہ اقبال نے ساری عمر اسی نظریئے کی تعلیم دی۔''

پیام اقبال کے تناظر میں پروفیسر آزاد زندگی کے جملہ مسائل پر جب گفتگو کرتے ہیں

توان کا انداز فکر علامہ اقبال کی طرح اعتدال اور امتزاج کے صبر آزما مرحلہ کو کامیابی کے ساتھ طے کرتا ہے۔ زندگی کی معنویت ان کے فکر و اظہار کا محور رہا ہے۔

اگر ہو آستاں سے ربطِ دل ، جب بات بنتی ہے
فقط ربطِ جبیں و آستاں سے کچھ نہیں ہوتا

اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی سیرتِ جلیلہ کا مشاہدہ پروفیسر آزاد نے آئینہ اقبال میں ہی کیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد معروف کا تبصرہ نہایت برمحل ہے:

Prof.Azad is a notable exception in that he has understood islam through Iqbal's own eyes as is obvious form this writings.His presentation of Islam is relicable and his sincerity in this regard is most priase-worth.

جگن ناتھ آزاد کی نعتیہ شاعری عقیدت کے بلند معیار کی غماز ہے جس میں ذکر و فکر، علم و عمل، عقل و وجدان کا دلنشین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔

مجھے اک محسن انسانیتؐ کا ذکر کرنا ہے
مجھے رنگ عقیدت فکر کے سانچے میں بھرنا ہے
وہ آیا فقر و فخری رتبہ ہے جس کی قناعت کا
وہ آیا معلم ہے جہاں میں دین فطرت کا

نعتیہ شاعری میں علامہ اقبال کے جداگانہ آہنگ اور اسلوب کی دوسری مثال عہد حاضر میں ملنی مشکل ہے۔ انہوں نے سیرت پاکؐ کے مختلف گوشوں کو اپنی بے پناہ تخلیقی عمل سے ایک جہاں معنی سے ہمکنار کیا ہے اور حضور رسالت مآب کے تئیں بے پناہ محبت کو معرفت و معنویت کے قالب میں ڈھال کر بدرجہ کمال اثر آفرین لہجے میں بیان کیا ہے۔

گردِ تو گردد حریم کائنات
از تو خواہم یک نگاہ التفات
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی

اے پناہِ من حریم کوئے تو
من بامیدے رمیدم سوئے تو
چوں بصیری از تو می خواہم کشود
تا بمن باز آید آں روزے کہ بود

جگن ناتھ آزاد کی نعت گوئی علامہ اقبال کا اثر لئے ہوئے جہاں اس کے رفعتِ اخلاص سے مملو ہے وہاں زبان و بیاں میں حیران کن حد تک اسلامی افکار، عقاید، تہذیب و روایت کا ادراک پایا جاتا ہے۔ مجلہ معارف اعظم گڑھ کے سابق مدیر اور اسلامی اسکالر مرحوم شاہ معین الدین احمد ندوی، پروفیسر آزاد کی نعتیہ شاعری کا احاطہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''آزاد صاحب اگر چہ ہندو ہیں لیکن اسلامی افکار و تصورات اور مسلمانوں کی تہذیب و روایات کے بڑے مزاج شناس ہیں۔ اسی لئے اسلامی موضوعات پر ان کی نظموں میں اسلامی روح بولتی نظر آتی ہے۔''

پروفیسر آزاد دربار رسالتؐ میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے سے قبل بارگاہ الٰہی میں آرزو مند ہیں کہ انہیں وہ پاکیزہ گفتار عطا ہو جو اس بے مثال جلیل و جمیل تاریخ ساز شخصیت کے مراتب عالیہ کے شایانِ شان ہو۔

پلادے معرفت کی جس قدر بھی ہے مَے باقی کہ
میرے لب پہ ذکر فخر موجودات ہے ساقی
اٹھا وہ جام جو احساس کی دنیا کو گرمادے
مرے جذبے کو اپنی ایک موجِ مئے سے چمکادے
جو مجھ کو بات کرنے کا مؤدبِ ڈھنگ سکھلادے
مری گفتار کی قوت پہ یہ احسان فرمادے
کہ اب مجھ کو گزرنا ہے بڑے نازک مقاموں سے
کبھی بطحا کی صبحوں سے کبھی یثرب کی شاموں سے

پہلا نکتہ جو پروفیسر آزاد کی نعتیہ شاعری سے ابھر کر سامنے آتا ہے، وہ ہے حقوق انسانی کی پاسداری، احترام آدمیت، بلا تفریق سماج کی تعمیر و تشکیل۔ چونکہ رسول اللہ محسن انسانیت ہیں،

جگن ناتھ آزاد سیرتؐ مقدسہ کے اس پہلو کو نہایت دلآویزی اور سلیقہ شعاری کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

مجھے لکھنا ہے اک انسانیت کا باب تابندہ
منور جس کے ہوں الفاظ مصرعے جس کے رخشندہ
مجھے اک محسنِ انسانیتؐ کا ذکر کرنا ہے
مجھے رنگِ عقیدت فکر کے سانچے میں بھرنا ہے
بیان کرنا ہے اوجِ ابنِ آدم بن کر کون آیا
بیاں کرنا ہے فخر ہردو عالم بن کر کون آیا

پروفیسر آزاد ختم مرتبت سید الانامؐ کی سیرت پاک کے ان سارے اعلیٰ اوصاف اور بلند مراتب کا مشاہدہ بخوبی کرتے ہیں جو بحیثیت انسان کامل آپؐ میں موجود ہیں۔

جسے حق نے کیا تسلیم ختم المرسلینؐ آیا
جسے دنیا نے مانا رحمۃ اللعالمینؐ آیا
خلیق آیا، کریم آیا، رؤف آیا، رحیم آیا
کہا قرآن نے جس کو صاحب خلقِ عظیم آیا
بصیرت عام فرماتا ہوا مردِ بصیر آیا
اندھیرے کی حکومت میں تجلی کا سفیر آیا
سراپا علم بن کر صاحب اُم الکتاب آیا
زمین تشنہ لب کی زندگی بن کر سحاب آیا
تجلی عام فرماتا ہوا شمس الضحیٰ آیا
امام الانبیاءؐ آیا محمد مصطفیٰؐ آیا

پروفیسر آزاد کی مثنوی جمہور نامہ میں ان کی ایک نعتیہ نظم ولادت باسعادت کے عنوان سے شامل ہے۔ ادبی اور دینی حلقوں میں اس کی بہت پذیرائی ہوئی، جس سے اس نعتیہ نظم کی افادیت اور مطابقت کا پتہ چلتا ہے۔ ممتاز اسلامی مفکر اور مورخ ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم نے اس کا فرانسیسی زبان میں منظوم ترجمہ کیا اور لکھا ہے کہ آزاد صاحب کی اس نعتیہ نظم کے مطالعہ کے دوران

ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہوئے۔

بشر بن کر زمانے کا جمال اولیں آیا
متاعِ صدق لے کر صادقِ الوعد و امین آیا
وہ آیا فقر و فخری رتبہ ہے جس کی قناعت کا
وہ آیا جو معلم ہے جہاں میں دین فطرت کا

ایک قادر الکلام نعت گو شاعر کی طرح جگن ناتھ آزاد نے دربارِ رسالت پناہؐ میں سلام کا ہدیہ بھی پیش کیا ہے۔ جہاں آپؐ کی مدحت میں عقیدت کے موتی بکھیر دیئے ہیں، وہاں تاریخی حقائق کی روشنی میں آں حضورؐ کو مظلومین، مستضعفین اور بے کسوں کا دستگیر قرار دیا ہے۔

سلام اے جلوہ معانی، سلام اے نوریزدانی
سلام اے وقت کی تقدیر کے ماتھے کی تابانی
سلام اے رحمت عالمؐ، سلام اے سید والاؐ
سلام اے فخرِ آدم، انبیا کے طرّہ زیبا
سلام اے دستگیر بے کساں، اے ہادی اکرمؐ
سلام اے دوجہاں کی زندگی کے محسنِ اعظمؐ
سلام اے دیو باطل کی کلائی موڑنے والے
سلام اے آدمی کا حق سے رشتہ جوڑنے والے

جگن ناتھ آزاد مسلمانوں کی پر شکوہ تاریخ اور ان کے زریں کارناموں سے نہ صرف واقف تھے، بلکہ ان سے متاثر بھی۔ اس کی ایک سبق آموز مثال ان کی ایک اور مشہور نظم ''بھارت کے مسلمان'' ہے اس نظم میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور محرومی کی اصل وجہ وہ قرآن اور صاحب قرآن سے ان کی لاتعلقی بتاتے ہیں اور عظمت رفتہ کی اقامت کا راز اس تعلق کے از سرِ نو استوار کرنے میں پوشیدہ دیکھتے ہیں۔

قرآن کی تعلیم سے پھر درس بقا لے
پھر روح میں پیغام محمدؐ کو بسا لے
گزرے ہوئے عظمت کے زمانے کو بلا لے

روٹھی ہوئی ایمان کی دولت کو منا لے
ایمان کی دولت کو گنوائے ہوئے انسان

بھارت کے مسلمان

مولانا ضیاء الدین اصلاحی اس نظم سے متاثر ہو کر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''یہ نظم مسلمانوں کی ہی ہمدردی و خیر خواہی میں بڑے اخلاص دل سوزی اور دردمندی کے ساتھ کہی گئی تھی۔ اس کے لئے جہاں سوز واثر میں ڈوبے ہوئے اس کے ہر بند نے تڑپایا وہاں ایک ہندو کے پند نصائح اور اسلامی و ایمانی حرارت سے لبریز اشعار نے عجیب حیرانی میں ڈال دیا۔

ہوں دیر میں یہ رنگ حرم دیکھ کر حیراں

پاکستان کے ایک اہم شاعر اسد ملتانی نے اس نظم کے اعتراف میں اپنی جوابی نظم ''ہمدردِ مسلمان'' کے عنوان سے لکھ کر پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا شکریہ یوں ادا کیا ہے:

تو خوش رہے اے حضرت محروم کے فرزند
اخلاص و محبت سے ہے معمور تیری پند
سن کر تری باتیں میری ہمت ہوئی دوچند
تونے دل مجبور کے سب کھول دیئے بند
دل سے تیرا ممنون ہوں اور بندۂ احسان

ہمدردِ مسلمان

یحییٰ اعظمی نے ''اعتراف و تشکر'' کے عنوان سے ایک طویل نظم کہی۔ اس کا ایک بند دیکھئے۔

بھارت کے مسلمان کے لئے یہ ترا پیغام
دراصل ہے اک ولولہ، تازہ کا انعام
تونے اسے بتلائے ہیں قرآن کے احکام
لب پر ہے تیرے زمزمۂ عظمتِ اسلام
سننا تھا جسے حامل قرآن کی زباں سے
وہ درس ملا اس کو ترے سوزِ فغاں سے

متین امروہی نے ''دیکھو یہ جگن ناتھ کیا خوب ہے انسان'' کے عنوان سے ایک متاثر کن نظم تحریر کی۔راقم نے یہ نظم پروفیسر آزاد کی رہائش گاہ واقع جموں میں ان کے کمرے میں آویزاں دیکھی ہے۔

موضوع کی مناسبت سے ایک اور اہم پہلو کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے۔ علامہ اقبال کی خوب صورت اور معرکۃ الارا نظم ''مسجد قرطبہ'' سے جگن ناتھ آزاد بہت متاثر تھے، بلکہ ان کی نظر میں یہ نظم پوری اردو شاعری میں Magnum opus کی حیثیت رکھتی ہے۔آزاد صاحب کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ فن تعمیر کے اس شہکار کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔خوش قسمتی سے جب وہ سرزمین قرطبہ پہنچے، انہوں نے پایا کہ وہاں کے لوگ انگریزی نہیں جانتے۔اس لئے مشکل یہ تھی کہ مسجد تک کیسے پہنچا جا سکے۔آخر ایک کتاب خریدی، جس میں مسجد قرطبہ کی تصویر تھی۔ پھر مختلف لوگوں کو یہ تصاویر دکھا دکھا کر مسجد تک رسائی حاصل کر لی ہیں۔آزاد صاحب کے بیان کے مطابق جونہی ان کی پہلی نظر اس قابل رشک فن تعمیر پر پڑی تو ان کی زبان سے بے ساختہ نظم مسجد قرطبہ کا یہ شعر جاری ہوا۔

کافر ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق وشوق
دل میں صلوٰۃ و درود،لب پہ صلوٰۃ و درود

رسول اکرمؐ کی حقیقی عقیدت اور محبت اخلاص کی دولت سے معمور ایک انسان کو فکر و جدان کے اس مقام تک لے جاتا ہے، جہاں وہ بزبانِ اقبال یہ اقرار کرنے پر خود کو عاجز پاتا ہے۔

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

پروفیسر جگن ناتھ آزاد بھی اس منزل سے بہت کامیاب گزرے ہیں۔

وہ علم ہے بے کار، خرد باعث آزار
بے گانہ ہے جو صاحب ''لولاک لما'' سے

☆☆☆

عبدالرحمٰن چغتائی

میرا فن اور شاعر مشرق

ایک ''ترجمان'' شاعر اور آرٹسٹ کا مقصد، زندگی کا ایک تصور اور اس کا ایک معیار پیش کرنا ہے۔ علامہ اقبال نے دنیا کے سامنے زندگی کا وہ تصور اور معیار پیش کیا ہے جو بنی نوع انسان کی نجات کا ذمہ دار ہے جو اس کے اپنے زاویۂ نگاہ سے مکمل ہے اور اس میں انسان اور انسانیت کے جوہر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس کا نام خودی ہو یا انا اقبال چاہتا ہے کہ ہر فرد زندگی کے معیار پر پورا اترے، اور فرد سے اس کی مراد محض مسلمان نہیں ہے بلکہ ہر وہ انسان ہے جو زندگی کی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف ہے۔

آرٹسٹ کی انفرادیت یہی ہے کہ وہ دوسروں سے مختلف ہو اور جو نقوش وہ تخلیق کرے انہیں سمجھنے اور پرکھنے کے لئے فکر کی ضرورت ہو۔ میں نے زندگی کی ترجمانی رنگوں اور خطوں سے ہی نہیں کی بلکہ ان عورتوں اور مجاہدوں سے بھی کی ہے جن کا تصور اقبال نے پیش کیا تھا۔ میری تخلیق اور میرے فکر کا ایک ہی مقصد ہے کہ زندگی پھلے پھولے ور زندگی کی فراوانی اپنے فطری تقاضوں سے ان ابدی خوشیوں سے جا ٹکرائے جن کو ایک عام نگاہ دیکھنے اور پرکھنے سے عاجز ہے۔

میری تصویروں میں غزال، آہو، شاہین، شتر اور گھوڑے گردن اٹھائے صحراؤں کی وسعتوں میں ان شتربانوں، حدی خوانوں، مجاہدوں اور صحرانشینوں کی راہ دیکھ رہے ہیں جنہوں نے زندگی کا معیار بلند کیا تھا۔ جینے کے لئے جدوجہد کی تھی اور عشق کی ترنگ میں زندگی کے تسلسل کو لالہ زار بنا دیا تھا۔ اقبال کا شاہین اور آہو اور غزال ان ہی مجاہد انسانوں کا گروہ ہے جس کو وہ کبھی خودی کے لئے اور کبھی زندگی کے لئے خطاب کرتا ہے۔

وہ محسوسات جو دیکھتے دیکھتے ایک وجدانی کیفیت اختیار کر لیتے ہیں۔ آرٹسٹ اور شاعر کو اونچا کر دیتے ہیں۔ ہم کتنی بھی پہلو تہی کریں، ان محسوسات کا تعلق براہ راست ایک مذہب سے ہوتا ہے جس پر ہمارا ایمان ہے۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ فنون اور شاعرانہ تخیل مذہب سے بالاتر ہیں، وہ اتنے ہی بھٹکے ہوئے ہیں، جتنا کہ آرٹ اور شعر مذہب کے قریب تر ہیں البتہ مسلمانوں کی مصوری کا بنیادی پہلو مذہب نہیں اور نہ اسے مذہبی ہونے کا فخر ہے سوائے ایک ردعمل کے جو نوعلم مصوروں اور صناعوں نے محض اس لئے رواج دیا کہ وہ کلامِ الٰہی کو منقش کرنے اور اس کا احترام بڑھانے میں مددگار ہوں۔

تصویریں روزمرہ کی بول چال یا عام فہم الفاظ نہیں ہیں، وہ شعر ہیں نظمیں اور گیت ہیں جن کو سمجھنے اور لطف اندوز ہونے کے لئے ایک صاحبِ ذوق اور مفکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثنوی مولانا روم، دیوان حافظ اور عمر خیام کی اس وقت تک کئی شرحیں کی جا چکی ہیں اور ان پر کتنے تبصرے لکھے جا چکے ہیں لیکن صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی ان کے اور ہمارے درمیان ایک دیوار حائل ہے اور اس دیوار کو ہٹانے کے لئے اور ان کے قریب تر ہونے کے لئے اور ان کے مدعائے تخلیق کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے ہم برابر کوشاں ہیں۔ یہی جذبہ ایک تصویر کو سمجھنے اور اس کے رگ و ریشہ کو پرکھنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔ پھر اتنی ہی عمر چاہیے جتنی ایک آرٹسٹ نے اپنی زندگی کے تمام تجربات کی بنا پر تصویر کو تصویر اور تخلیق کو تخلیق بنانے میں صرف کی ہے۔

اسلامی فنون کی روایات کتنی بھی اہم، شاندار اور ناقابل فراموش کیوں نہ ہوں۔ اُن پر کئی دور آئے اور کئی دور چلے گئے اور ہم نے ہر بار ایک نیا معیار، ایک نئے مستقبل کا پتہ دیا اور اس مستقبل کی ٹوہ میں ایک نیا جہان آباد کر دیا، مگر وہ بنیادی عنصر جو اقبال کی عمیق نگاہی نے عقل اور عشق کے امتیاز اور سمجھوتے کے لئے پیش کیا ہے۔ اس سے ان وسعتوں اور کشادہ راہوں کا پتہ چلتا ہے جن کی وجہ سے اسلام پھلا پھولا اور اس نے ایک ایسے بلند آہنگ معیار کی طرف توجہ دلائی جس سے فنون کو کبھی انحطاط کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ میں اسی ضرورت کے احساس سے، اسی حقیت کی دیکھ بھال کے سلسلے میں، خود آشنائی اور خودنگری کے لئے، اسی روحانی اور رومانی

ارتقائی نظریے کے لئے اپنے فن کا پیچھا کرتا چلا آرہا ہوں تا کہ وہ سرفراز رہے۔

میرے آرٹ میں اس مستقبل کی جھلک ہے، اور مجھے ان روایات کی ترجمانی مقصود ہے جن کے لئے اقبال نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اقبال نے ہمارے تنزل پذیر ماحول کا جائزہ اس شدت اور دیانتداری سے لیا تھا کہ اس کی انفرادیت ایک قومی سرمایہ اور ایک متاعِ حیات بن گئی۔ اقبال نے اپنے ماضی سے وہ ہمہ گیر رشتہ استوار کیا اور ان امور پر روشنی ڈالی کہ ثقافتی قدریں پھر سے اپنے تقاضوں کی بناء پر حال اور ماضی سے بغلگیر ہونے لگیں۔ میرا یہ خبط بڑھتے بڑھتے مجھے ایک ایسے مقام کی طرف لے اڑا جس میں میرا اپنا مستقبل اور ساتھ ہی میرے فن کا وہ مستقبل پوشیدہ تھا، جسے میں سب سے زیادہ حسین جامع اور لافانی خیال کرتا ہوں۔

میں نے ایک تصویر بنائی جو یقیناً خام اور تکنیک کی رو سے بھی نامکمل تھی۔ مگر میرا خیال تھا کہ میری یہ کوشش کامیاب ہے اور مجھے اس کا صلہ ملنا چاہئے۔ میرے ایک عزیز دوست جو علامہ اقبال کے بہت قریب تھے۔ مجھے مجبور کر کے ان کی خدمت میں لے گئے۔ میرے لئے علامہ اقبال کو قریب سے دیکھنے اور ان سے ہم کلام ہونے کا یہ پہلا موقع تھا وہ ان دنوں انارکلی بازار میں رہتے تھے اور پہروں بالکونی میں بیٹھے رہتے تھے جب میں سیڑھیاں چڑ رہا تھا تو میں یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ میں تصویر دکھانے جارہا ہوں بلکہ میرے ذہن میں یہ خیال بڑی شدت سے کروٹیں لے رہا تھا کہ میں شمع وشاعر کے خالق کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ تعارف کے بعد انہوں نے یکے بعد دیگرے مجھ پر کئی سوال کر دیئے، ایک سوال یہ بھی تھا کہ کیا یہ تمہارا پیشہ ہے؟ میں نے کہا کہ میرا تو ایسا خیال نہں ہے مگر میرے بزرگ ہنرمند، صناع اور مہندس ضرور تھے۔ میں نے اپنے علم کی کمی اور مطالعہ کی کم مائیگی کے سبب تصویر کا نام Too Late رکھ دیا تھا۔ میں نے دبی زبان سے، جیسے میں صحیح تلفظ بھی ادا نہ کر سکوں گا۔ تصویر دکھاتے ہوئے تصویر کا نام لیا تو انہوں نے بے ساختہ یہ شعر پڑھا۔

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصود ہر پروانہ تھا
اب کوئی سودائی سوزِ تمام آیا تو کیا

تصویر میں سب سے اہم ایک قبر تھی جو ایک شاندار عمارت کے گوشۂ تنہائی میں افسردہ سی نظر آ رہی تھی اور یہی حال اس ماں صفت خاتون کا تھا جو کچھ پھول لئے قبر کے پاس یوں کھڑی تھی کہ وہ کچھ کھو گئی ہے اور کچھ حاصل کرنے کی تلاش میں یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ عقائد کی بناء پر قبر کے تعویذ پر میں نے کلمہ لکھ دیا تھا۔ آپ نے تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے میری کوشش کو سراہا اور فرمایا کہ ایک تو یہ کلمہ یہاں سے ہٹا دینا چاہئے۔ دوسرے جو عورت کھڑی ہے اسے اور زیادہ پریشان نظر آنا چاہئے۔ تیسرے ایک افسردہ عورت قبر کے پہلو میں بیٹھی ہو جو اپنی متاع لٹا چکی ہے۔ باقی رہا قبر کا تعویذ تو اس پر قرآن پاک کی یہ آیت لکھ دو۔ **وان اللہ یبعث من فی القبور** ۔ آپ نے فرمایا مجھے پہلی دفعہ ایک ایسے نوجوان سے واسطہ پڑا ہے۔ جو تصویروں کے ذریعہ اسلامی روایات پیش کرنے کا جذبہ رکھتا ہے۔

میں علامہ اقبال کی خدمت میں برسوں حاضر ہوتا رہا میں پہروں ان کے دربار میں، ان کی عظیم شخصیت کے سامنے سر جھکائے ان کے افکار و نکات سنتا رہا۔ میرا تجربہ ہے انہیں تکنیک اور فنی کوتاہیوں کو پورا کرنے کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہ فن محض کے قائل نہ تھے، وہ آخری لمحوں تک تھیوری کا پیچھا کرتے رہے اور جہاں جہاں بھی انہوں نے فن یا فن کار کو خطاب کیا ہے۔ شاعرانہ موشگافیوں اور ''صنعتی'' پیچیدگیوں سے دامن بچایا ہے اور فن کو اپنے فلسفہ کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ فن میں رجائیت ہو، ہیئت اور مواد پوری شدت کے ساتھ زندگی کا ساتھ دیں تا کہ فن اور انسان دونوں تنزل سے بچے رہیں۔

انہوں نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے کافی وقت دیا۔ میرے کام میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ کبھی کبھی میرے ہاں آتے رہا کرو۔ میرے دماغ میں بھی اکثر ایسی تصویریں بنتی رہتی ہیں۔ مجھے آرٹسٹ بھی ہونا چاہئے تھا۔ تا کہ میں رنگوں کے ذریعے بھی اپنے خیالات ظاہر کر سکتا۔ انہوں نے اس وقت نواب ذوالفقار علی خان اور سردار جوگندر سنگھ کا بھی ذکر کیا کہ وہ آرٹ کے مداحوں میں سے ہیں۔ آپ نے وعدہ کیا کہ وہ ان سے بھی میری ملاقات کرائیں گے تا کہ مجھے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہو۔ میرے دوست اور میں جانے لگے تو انہوں نے ہاتھ ملایا اور اٹھ کر رخصت کیا۔ اقبال کا اخلاق خالص انسانوں

کا اخلاق تھا اور انسانیت کی پاکیزہ قدروں کا حامل تھا۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو کو میں کبھی فراموش نہ کر سکا۔ یہ تصور ہر موقع پر میرے کام آتا رہا۔

میں اپنے بامروت دوست سے رخصت ہو کر تصویر کو بغل میں دبائے قدم قدم چلتا رہا ۔اس طرح چلتا رہا جیسے کوئی نئی شاہراہ ہو کوئی نئی سرزمین ہو جس پر نئے نئے مکان تعمیر ہوں اجنبی اجنبی لوگ آباد ہوں۔ ان کے اپنے تقاضے ہوں اور ان کا ایک اپنا معاشرہ ہو جس سے وہ وابستہ ہوں۔

قدرت کو جب کسی سے کام لینا مقصود ہوتا ہے تو وہ خود ہی ایسے وسائل پیدا کر دیتی ہے کہ دھندلے دھندلے نقش ابھرنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یوں تو کشمکش ہر زمانے میں جوں کی توں رہتی ہے۔ مگر دیکھتے دیکھتے اس میں شدت آجاتی ہے اور وہ شدت ہی ایسے اسباب اور انداز پیدا کر دیتی ہے جو فن کار کو اس کے اصلی مقام کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی موڑ تھا جو ہیئت اور مواد کو بدلنے میں میرے بہت کام آیا۔ میں روایت پسند تھا مگر اس ردعمل نے مجھے روایت پسندی کے ساتھ ہی وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش پر بھی مجبور کیا اور میں سماجی کوششوں کے امکانات پر غور کرنے لگا۔ امکانات کے ساتھ محسوسات نے بھی کروٹ لی۔

میرے ایک دوست مولوی بشیر بازار حکیماں کے مشہور وکیل مولوی احمد دین کے صاحبزادے تھے، مولوی صاحب پہلے آدمی تھے جنہوں نے علامہ اقبال کی شاعری شخصیت اور ان کے حالات زندگی پر کتاب لکھی۔ اس کی اشاعت کے ساتھ ہی علمی وادبی حلقوں میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مولوی احمد دین وکیل سے علامہ کے دوستانہ مراسم تھے یہ ان دنوں کی سرگزشت تھی جب اقبال بازار حکیماں میں قیام پذیر تھے اور بیشتر وقت وہیں بیٹھے محو گفتگو نظر آتے تھے۔ اتفاقیہ ایک روز پھر وہی دوست مجھے چوک متی میں ملے اور دریافت کیا کہ اقبال کے ہاں گئے تھے؟ اور کیا وہ ترمیم جو انہوں نے تصویر میں مکمل کر لی۔ ترمیم یقیناً ضروری تھی مگر وہ تصویر جو اتفاقات کا کرشمہ تھی۔ جو ایک اختراع تھی، اس کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر پہنچتے ہی میں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے تھے۔ میری رائے میں ترمیم کے معنی یہی تھے کی تصویر نئی بنائی جائے۔ میں نے اپنے دوست کو بتایا کہ میں نے ترمیم کر لی تو ضرور جاؤں گا۔

چوک متی ان دنوں کباڑیوں کا بازار کہلاتا تھا۔ ہندو مسلمان بلکہ ایک آدھ سکھ کباڑیا بھی وہاں نظر آجاتا تھا۔ یہ لوگ انگریزوں کے بنگلوں سے فرنیچر اور کراکری کے علاوہ آرٹ پر کتابیں اور رسالے بھی فروخت کے لئے لاتے تھے اور ان دنوں میرے جیسے کم وسائل لوگوں کے مطالعہ کا یہی ایک ذریعہ تھا کہ کباڑیوں کی کتابوں اور رسالوں سے استفادہ کیا جائے مجھے ایک کباڑیے کے الفاظ آج تک یاد ہیں کہ مولوی محبوب عالم مالک پیسہ اخبار کو ہماری ہی دوکانوں سے وہ ورق ملا تھا جس کی برکت سے وہ بڑا آدمی بن گیا اور تمہیں بھی وہ ورق ملنے والا ہے مجھے یہ خوشخبری اس لئے ملی تھی کہ میں ہر شام چوک متی جاتا تھا اور کباڑیوں کی دوکانوں سے مطالعہ کیلئے غذا حاصل کرتا تھا۔

مجھے ان دنوں سہ سمتی تصویروں کو چھوڑ، دوسمتی تصویروں کا بھی فرق معلوم نہ تھا۔ تصویر دیکھنی بھی پوری طرح سے نہ آتی تھی تصور اور صورت اپنے بس کی بات نہ تھی۔ بس ایک جنون کارفرما تھا کہ کوئی ایسا راستہ مل جائے جو قوت متخیلہ کو ابھرنے اور سنورنے کا موقع دے۔ قوت متخیلہ کو جمالیاتی ادراک اور تخلیقی صلاحیتوں کی ضرورت تھی۔

آخر وہ وقت آگیا کہ تصویر Too Late یا سوز تمام، پھر سے تیار ہوگئی اور میں سوچنے لگا کہ علامہ کو دکھانی چاہئے شاید اس میں وہ تخلیل اور جذبہ اجاگر نظر آئے جو اقبال ایک پیغام کی صورت میں اپنی شاعری کے راستے پہنچانا چاہتے ہیں۔ مذہبی مصوری کا درجہ دور احیاء کے مصوروں نے اپنے تخیل، قلم اور رنگوں سے اس قدر بلند اور غیر فانی بنادیا تھا کہ شاید دنیا کی مصوری پر پھر ایسا دور نہ آئے۔ جسے صدیوں پہلے صلاحیتوں، ہیئت مواد اور نظریے نے کچھ اس انداز سے قدم بڑھائے کہ انسانی شعور مذہب کے دائرے تک محدود نہ رہ سکا میں نے مولانا ظفر علی خان، سر عبدالقادر اور دوسرے کئی سخن وروں اور سخن فہموں کو اقبال کے ہاں دیکھا تھا' ممکن ہے انہوں نے میری تصویریں کو مذہبی عینک سے نہ دیکھا ہو مگر قومی روایات سے ضرور جاملایا تھا۔ میں خیال کرتا ہوں کچھ بھی تھا وہ تکنیک اور فن کی لوچ لچک سے دور تھے۔ داد دیتے تھے، تبصرے ہوتے تھے مگر میں جانتا تھا کہ مجھے اپنے فن میں متحرک حسن اور جمالیاتی سحر لانا ضروری ہے۔

1919ء میری تصویریں پہلی بار پنجاب فائن آرٹ سوسائٹی کی نمائش میں پیش ہوئیں تصویر Too Late بھی ان میں موجود تھی اور وہ اپنی بناوٹ اور استخواں بندی کی رو سے تسکینِ قلب کا سامان لئے ہوئے تھی۔ نمائش کے افتتاح پر میری بہت سی تصویریں فروخت ہوئیں۔خصوصیت سے نواب بھاولپور نے تصویر ''سوز تمام'' اور دوسری تصویریں خریدیں۔ داد و دہش کا ایک غلغلہ بپا ہوا اور میں اس حوصلہ افزائی سے بہت متاثر ہوا۔ جذباتی کسک کو تو ایک آہنگ ملا۔ مگر شکر ہے کہ میں اسی پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ گیا۔ میرے رنگوں اور خطوں کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔

تصویر سوز تمام، الٹ پلٹ کر دس بارہ مرتبہ سے کیا کم بنائی ہوگی اور ہر بار اس کی تکمیل کا تصور کچھ نیا ہوتا تھا۔ مگر پیٹرن بدلنا ناممکن ہو گیا تھا سب سے پہلے تصویر یعنی اوریجنل پیٹرن نواب بھاولپور نے خریدی اور اس کے بعد کسی نہ کسی صاحبِ ذوق اور اہل نظر کی تسکینِ قلب کا سامان بنتی رہی۔ مہاراجہ پٹیالہ، نواب سالار جنگ، مہارانی کوچ بہار، سر اکبر حیدری، سر سپرو کے علاوہ سب سے بہتر پیٹرن جس سے آرٹسٹ کو بھی تسکین قلب کا کچھ سامان ملا وہ تصویر تھی جس نے جدید ہندوستانی مصوری کو مغرب میں بھی مقبول بنا دیا تھا۔ خصوصیت سے کلکتہ بمبئی، مدراس، دہلی اور شملہ کی نمائش تو قابل رشک تھیں اور یہ سلسلہ تقسیم ہندوستان تک برابر جاری رہا۔ بلکہ جنگ کے زمانے میں زیادہ شدت اختیار کر گیا تھا۔ یہی ایک ذریعہ تھا جس سے آرٹ اور آرٹسٹ پلتا تھا اور داد و تحسین حاصل کرتا تھا اور اس کا وجود قومی املاک میں شامل سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ گرمیوں کے زمانے میں، انگریز کے ذوقِ نظر کی تسکین کیلئے ترچنا پلی، مسوری نینی تال' کوڈی کنال، کشمیر، اوٹی، دار جلنگ اور شملہ میں بڑی بڑی شاندار نمائشیں منعقد ہوتی تھیں۔ نواب' مہاراجے اور مہارانیاں ہزاروں اور لاکھوں تک کی تصویریں حاصل کر لیتی تھیں اور ہندوستان کے ہر انگریزی پرچے میں ان کے چرچے ہوتے تھے ان پر تبصرے کئے جاتے تھے۔ آرٹسٹوں کے نام بڑے احترام سے لئے جاتے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں آرٹسٹوں کو انعام ملتے تھے اور ہزاروں روپے میں تصویریں فروخت ہو جاتی تھیں۔ حالات اور بعض خصوصیات کی بناء پر میں واحد مسلمان آرٹسٹ تھا۔ جو ہندوستان کی ہر نمائش میں پیش پیش نظر

آتا تھا۔ آج بھی یہ آرزو چٹکیاں لیتی ہے کہ کاش ایک ایسی نمائش ہوتی ایک ایسا مقام ہوتا جسے مرکزی حیثیت حاصل ہوتی اور ہم مل کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور ایک دوسرے کے قریب ہوتے۔

تصویر ''سوزِ تمام'' کی مقبولیت پر آج بھی سوچنے بیٹھوں تو مرکزی نقطہ نگاہ سے تصویر میں قبر کے استعارے ہی میں ایک ایسی کشش نظر آتی ہے جس نے اسے اس حد تک مذہبی ،قومی ،سماجی اور بین الاقوامی بنا دیا تھا کہ اقبال جیسا مفکر بھی متاثر ہوا۔ جب میں اسے دوبارہ سہ بارہ بنانے کیلئے اپنا قلم اٹھاتا تو میرے لئے یہ خیال خضر راہ بن جاتا کہ تو دس بارہ کتابوں کو پڑھنے کی بجائے ایک کتاب کو دس بارہ دفعہ پڑھتا چلا جا۔ اس سے میرے فن میں جلا اور حرکت پیدا ہوتی اور جب اسے ڈاکٹر خلیفہ حکیم نے دیکھا تو شعر پڑھا اور اس کا نیا نام تجویز کیا۔ ڈاکٹر تاثیر کے مشاہدے میں آئی تو اس نے کئی شعر پڑھے۔ علامہ اقبال نے اسے دیکھا تو شمع و شاعر کا شعر چسپاں کر دیا۔

''نیرنگ خیال'' میں میرے فن پر کئی تبصرے ہوئے مطالعہ نگاروں کو قریب تر لانے کیلئے بہت سے تبصرے ڈاکٹر تاثیر کے مرہون منت تھے۔ انہیں آرٹ کا گہرا شعور تھا اور بڑی سوجھ بوجھ تھی۔ ان کی موت سے یہ ایک عظیم نقصان ہمارے علم ادب اور آرٹ کو پہنچا ہے کہ آج ان جیسا کوئی نقاد و تبصرہ نگار اور آرٹ کی گہرائیوں کو سمجھنے والا پاکستان بھر میں موجود نہیں ہے۔ جب بھی دوست مل بیٹھتے آرٹ بہر صورت موضوع گفتگو تھا۔ ان مجلسوں میں تاثیر، پطرس ، بخاری، سید امتیاز علی تاج، ڈاکٹر نذیر مجید ملک، حفیظ مولانا چراغ حسن حسرتؔ، صوفی تبسم، غلام عباس، سالک شامل ہوتے تھے۔ میری تصویروں پر کئی ایک شعراء نے شعر کہے نظمیں لکھیں ۔ حفیظ' تاثیر' قیصر' جعفری' قتیل شفائی کے علاوہ مخدوم محی الدین نے بھی میری تصویروں کو موضوع شعر بنایا۔

ان محفلوں میں بعض ایسے لوگ بھی شامل ہو جاتے تھے جو شعروں پر تصویریں بنانے کا مشورہ دیتے اور بڑے بڑے دلچسپ شعر پیش کرتے۔ تصویر نما شعروں میں شاید سب سے بہتر کارٹوں اس مصرعہ کا تھا جو یاد رہ گیا۔

سرِ دستاں سلامت کہ تُو خنجر آزمائی

اس میں ایک حسینہ کو ایک مفکر کا گلا کاٹنے کا اختیار بخشا جاتا ہے اور پھر اس کے اپنے خنجر سے، ہمارے ہاں یہ جذبہ صدیوں سے چلا آرہا ہے کہ تصویر دیکھی اور شعر بیدار ہوا۔ شاہنامہ فردوسی، خمسہ نظامی، حافظ، عمر خیام، لیلیٰ مجنوں، یوسف زلیخا، غرض کون سی تصنیف ہے جس نے نظم میں ڈھلنے کے بعد تصویر کا روپ اختیار نہیں کیا۔ ویسے بھی ہمارے ہاں ایسے ایسے لاجواب اور بے مثل شعر پائے موجود ہیں جو رومانی اور روحانی جذبوں اور ولولوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان سے رنگ اور خط رقصاں نظر آتے ہیں مجھے یقین ہے کہ اقبال کے ہاں یہ ولولے اور جذبے اس درجہ بلند اور روح کی بالیدگی کا سامان رکھتے ہیں کہ انسان کا کردار آسمانوں میں کمندیں ڈالنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میں نے ابتداء میں ایک تصویر لیلیٰ کی صحرا نوردی پر بنائی اور اسے علامہ اقبال کو دکھانے کا موقع نکالا۔ آپ نے تصویر دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا

دیکھ آکر کوچہ چاکِ گریباں میں کبھی
قیس بھی تو لیلیٰ بھی تو صحرا بھی تو محمل بھی تو

ڈاکٹر تاثیر نے بھی تصویر دیکھی تو یہ شعر پڑھا۔

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ
صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

ان تبصروں نے میرے اندر یہ جذبہ پیدا کر دیا کہ تصویر کو دیکھنے اور سمجھنے کا حق سب اہل ذوق کو ہے اور نقادوں اور اہل ذوق کو تو پورا اختیار ہے۔ اس صورت میں آرٹسٹ کچھ نہ بولے اور چپ رہے۔ مرقع چغتائی غالب کا مصور ایڈیشن اسی بناء پر کامیاب ہوا۔ اس کے دیکھنے اور سمجھنے والوں میں مولانا ظفر علی خان، علامہ اقبال، سر عبدالقادر، سر امرناتھ، ڈاکٹر تارا چند، مولانا نیاز فتح پوری، ڈاکٹر تاثیر، پطرس، امتیاز علی تاج، حافظ محمود شیرانی، نواب بھوپال، اعلیٰ حضرت نظام، سر اکبر حیدری، سر کرشن پرشاد شاد، سر راس مسعود اور سر سپرو جیسے اردو نواز لوگ شامل تھے۔ کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ مجموعی طور پر یہی کہا گیا کہ اکثر تصویریں خود غالب

کے اشعار سے بھی بلند نظر آتی ہیں۔

''کارواں'' کی اشاعت تجارتی اغراض کے زیر اثر عمل میں آئی تھی۔ وہ ایک بنیادی کوشش تھی جو آج پھل پھول لائی ہے۔ اس میں نیاز مندان لاہور کا جذبہ اور تجریدی نظریہ کام کر رہا تھا۔ ترقی پسند تاثیر لیڈر تھا۔ اس نے آرٹ اور ادب کیلئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ ان اعلیٰ مقاصد کو لئے ڈاکٹر تاثیر، میرے بھائی رحیم اور میں ایک روز علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ وہ سالنامہ کارواں کیلئے کوئی اردو نظم عنایت کریں۔ باوجود بار بار کے تقاضوں کے وہ انکار کرتے رہے۔ ایک رات ہم نے پھر ہلّہ بولا۔ تاثیر، عبد اللہ، رحیم اور میں ساتھ تھے۔ انہوں نے تاثیر کو کہا کہ کوئی شعر پڑھو۔ پھر ان کے ایماء پر تاثیر نے اپنے بھی کئی شعر پڑھے۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ لو نظم ہوگئی ہے۔ لکھتے جاؤ۔ ایک شعر پر رکے اور تصویروں کے ذکر سے اہرام مصر تک جا پہنچے۔ میں نے عرض کی فرعون کا دعویٰ تو باطل تھا مگر تجریدی تھا۔ پھر آج کے فن کی طرح فن مطلق بھی نہ تھا۔ ان کا زندہ فن آج بھی انسانوں کی ترقی میں حائل نہیں ہوا۔ اس گفتگو کے دوران نظم مکمل ہوگئی۔ یعنی شعر بھی ہوتے رہے اور تصویروں کے خاکے بھی ساتھ ساتھ بنتے رہے۔

اپنی آوارگی سے لپٹا لپٹایا گھر لوٹا تو پیغام ملا کہ شاعر مشرق نے عبد الرحمٰن کو یاد کیا ہے۔ دوسرے دن حاضر خدمت ہوا تو آپ میرے انتظار میں تھے اور کچھ بیتاب سے تھے۔ انہوں نے اپنی شاہکار نظم ''میلاد آدم'' مکمل کی تھی جس کا ہر شعر آج بھی ایک تصویر نظر آتا ہے۔ بلکہ کئی شعر ایسے بھی ہیں جن پر کئی کئی تصویریں بنائی جاسکتی ہیں۔ آج بھی میرے لئے اس نظم میں وہی بصیرتیں وہی گہرائیاں اور وہی معانی ہیں جن کے عرفان کی آپ ہمیشہ دعوت دیتے تھے۔ پڑھتے پڑھتے جب ان کی آواز میں بے پناہ اعتماد پیدا ہوتا تھا تو میں اپنی کمزوری کو زیادہ دیر نہ چھپا سکتا تھا۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ میں نے عرض کی مجھے فارسی سمجھنے میں دشواری محسوس ہو رہی ہے۔ ایک دم ان کا موڈ بدل گیا اور مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگے مگر لمحہ بھر کے اندر پھر اسی خلوص سے متوجہ ہوئے اور آخر مجھے اشعار کے سوز و ساز اور ان کے معنیٰ سے آشنا کر دیا میں یوں محسوس کرنے لگا جیسے میں نظم کی غرض و غایت اور اس کی پختگی کے ساتھ ساتھ اڑتا چلا جارہا

ہوں۔ اب وہ ایسے مام پر تھے جہاں آدم کی کشمکش کا ذکر پورے جلال پر تھا کہ میں بے وجہ بول اٹھا۔ شیطان نے اپنی خودی برقرار رکھتے ہوئے یعنی سجدے سے سرکشی کرتے ہوئے وہ سب کچھ دیکھ لیا ہوگا جو خدا نے آدم کو ودیعت کیا تھا۔ وہ میرے بیان کی وضاحت پوچھنے لگے اور میں نادم سا ہو گیا۔

بعد میں 'خونین جگرے' اور 'صاحب نظرے' پر غور کرنے لگا میں نے انہیں اس نظم پر کئی سکیچ بنا کر دکھائے تھے۔ ان کی تنقید چاہے وہ کسی رنگ میں ہوتی تھی میرے لئے خضر راہ کا کام دیتی رہی۔ جب دیوان غالب چھپ کر تیار ہوا تو ڈاکٹر تاثیر اور دوسرے دوستوں نے سوچا کہ قبلہ ڈاکٹر صاحب سے بطور تعارف کچھ لکھوانا چاہئے۔ آخر ہمارے علم و ادب میں یہ اشاعت ایک منفرد درجہ رکھتی ہے۔ میرے بھائی عبداللہ اور عبدالرحیم اور یاد نہیں اور کس کس نے تاثیر کا ساتھ دیا۔ تاثیر سب کو لے کر حاضر خدمت ہوا۔ پہلے تو آپ نے معذرت کی اور آرٹ کے مطالعہ کی کمی کا عذر کیا۔ پھر خود ہی تجویز کیا کہ تاثیر لکھ لائے میں دستخط کروں گا۔ ڈاکٹر تاثیر نے دو تین دفعہ کوشش کی مگر انہیں کچھ پسند نہ آیا اور فرمایا یہ سب کچھ چھوڑ جاؤ میں دیکھوں گا۔ دوسرے دن صبح صبح الٰہی بخش آیا اور تعارف نامہ میرے بھائی عبداللہ کو دے گیا۔ یہ خود ان کا اپنا تحریر کردہ تھا۔

جب بھی میں حاضر خدمت ہوتا تھا وہ کافی توجہ دیتے تھے۔ زندگی نئے سانچوں میں ڈھل رہی تھی شعور نئے رشتے تلاش کرنے کے درپے تھا۔ ڈاکٹر ٹیگور کی مقبولیت نے اور پھر انہیں نوبل پرائز ملنے سے دنیا کی ہر قوم ایک دوسرے کے بارے میں سوچنے لگی۔ مغرب نے مشرقی روحانی اور رومانی اہمیت کے علاوہ مشرق کے آرٹ اور آرٹسٹوں کی طرف دی۔ سرمایہ دار طبقے کی خباثت خود مغرب کیلئے تلخ ہو رہی تھی۔ اس وقت خود مجھے بھی مشرقیت کی روایات کا زیادہ شدید احساس ہوا۔ نگاہوں نے معاشرے کی ضرورت محسوس کی اور جمالیاتی نظریوں کی انفرادیت نے قدامت پسندی کے رجحانات میں ایک ایسا پتھر دے مارا کہ اس کی صدا کا تسلسل آج تک نہیں ٹوٹا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی سطح اور بھی گہری ہے اور وہ پتھر ابھی اپنے مقام تک نہیں پہنچ پایا۔

علامہ اقبال بھی دیوان غالب کی اشاعت کے بعد اپنے کلام کی مصور اشاعت کے بارے میں سوچنے لگے تھے اور میں ان کو موقع بہ موقع یقین دلاتا رہتا تھا کہ یہ کام میرا فرض ہے اور میرے فن کا جزو اعظم ہے اور میں اسے اتنے ہی وسیع اور اعلیٰ پیمانہ پر انجام دوں گا۔ جس کا اظہار میں مرقع چغتائی اور نقش چغتائی میں کر چکا تھا۔ مگر حالات سازگار نہ ہوئے، کچھ میں ان کی ضرورتوں کو پورا نہ کر سکا اور کچھ وہ بھی حالات کے زیر اثر قدم نہ بڑھا سکے۔ وہ ڈانٹے اور گوئٹے کے مصوّر ایڈیشنوں سے بڑے متاثر تھے۔ عمر خیام کے بڑے بڑے قیمتی اور خوبصورت ایڈیشن میں انہیں دکھاتا اور ان کی مقبولیت کا احساس دلاتا رہا اور کہتا رہا کہ مغرب کو مشرق کا یہ انداز بہت بھاتا ہے۔ مشرق نے خصوصیت سے اسلام نے تصویر اور شعر کے رشتوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ اور اس جمالیاتی تصور سے میں اکثر دو چار رہتا ہوں کہ کوئی تصویر کسی شعر کیلئے بناؤں یا نہ بناؤں دیکھنے والا اسے شعر ہی کے پیمانے سے ناپتا ہے۔

میں نے مرقع چغتائی اور نقش چغتائی کے انداز میں اقبال کے مصور ایڈیشن کا نام عمل چغتائی رکھ دیا ہے۔ افسوس ہے کہ میں اقبال کی اس شدید آرزو کو ان کی زندگی میں اشاعت کے قابل نہ بنا سکا مجھے پورا پورا یقین ہے کہ یہ جمالیاتی تصور، یہ نظم و تناسب، یہ رنگ اور خط، یہ میری انفرادیت، اقبال کے کرداروں اور اس کے تخیل سے متعلق متمدن ملکوں کا نظریہ بدل دے گی مجھے شاعر مشرق اور عمل چغتائی کی تکمیل میں یہ روحانی اطمینان بھی محسوس ہوتا رہتا ہے کہ علامہ اقبال کے اس مصور ایڈیشن کی کئی تصویریں شاعرِ مشرق نے اپنی احیات میں دیکھیں اور ان کرداروں کی ہیئت اور مواد کا اندازہ کیا جنہیں میں نے آج کی سائنٹیفک ذہنیت اور فن مطلق کی الجھنوں سے پہلو تہی کرتے ہوئے اور اپنی انفرادیت کو بچاتے ہوئے تصویروں میں ڈھالا۔

پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے سلسلے میں اقبال لندن میں تھے اور میں بھی اتفاقیہ وہاں موجود تھا۔ وہ راتیں گہما گہمی سے اتنی بھرپور تھی کہ آج بھی ان کی یاد تازہ دم بنا دیتی ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اقبال میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھے قوم کے الجھے ہوئے مسائل پر تبصرے کر رہے ہی۔ لندن کی ان محفلوں میں خصوصیت سے رات کے وقت

سر ملک عمر حیات خان ٹوانہ، چودھری رحمت علی پاکستانی، مولوی عبداللہ چغتائی، سردار الیار، میر مقبول، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور دوسرے کئی ہندو اور سکھ سیاستداں جمع ہوتے تھے۔ علامہ کی خواہش تھی کہ میں لندن میں اپنی تصاویر کی نمائش کروں اور اس کا افتتاح سر آغا خان سے کرایا جائے۔ انہوں نے کئی انگریز سیاستدانوں اور صحافیوں سے میرے آرٹ کا ذکر کیا۔ اور تعارف کرایا اور ہمیشہ میرے فن کی ترقی اور وسعت کی آرزو کرتے رہے۔

ایک دن وہ اپنی خاص ادا کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھے ایک انگریز سیاستداں سے جو اپنی قوم کا امتیازی لیڈر اور لارڈ تھا۔ سیاست سے ذرا ہٹ کر رسول اکرمؐ کی شخصیت اور آپ کی تعلیم پر تبصرہ فرما رہے تھے۔ آپ تو مسلمان کی حیثیت سے ہمہ تن اظہار تھے ہی مگر وہ انگریز بھی متاثر نظر آ رہا تھا اور جب وہ رخصت ہوا تو میں نے عرض کی قبلہ جو کچھ آپ نے فرمایا وہ حقیقت تو تھا ہی مگر آپ نے اسے کتنی حسین حقیقت بنا دیا۔ مگر میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ کیا خدا کو آج تک اپنے کسی پیغمبر کو مغرب میں بھیجنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی؟ کیا مغرب شروع سے ہی افضل ہے۔ میں انگلستان کا گاؤں گاؤں پھرا ہوں مجھے چھوٹے سے چھوٹا گاؤں بھی بہشت سے کم نظر نہیں آیا، حالانکہ سورج مشرق سے نکل کر پہنچا مغرب میں ڈوبتا ہے، انہوں نے آج برسوں کے بعد پھر انہی نظروں سے دیکھا جب وہ میلاد آدم والی نظم کی تفسیر بیان فرما رہے تھے اور میں نے بے ساختہ پوچھ لیا تھا کہ شیطان نے سجدہ سے انکار کے وقت وہ سب کچھ دیکھ لیا ہوگا جو خدا آدم کو ودیعت کر رہا تھا۔

میرے آرٹ میں اس مستقبل کی جھلک اور روایات کی ترجمانی نظر آتی ہے جن کے لئے اقبال نے اپنی قیمتی زندگی وقف کر رکھی تھی میں نے کوشش کی ہے کہ اس تنزل پذیر ماحول کی شدید ضرورت کو یعنی اس نظریے کو پیش کروں جو زندہ قوموں کا خاصہ رہا ہے تا کہ ہماری فنی اور معاشرتی موت نافہم ہاتھوں سے واقع نہ ہو جائے۔ سماجی شعور اور ملکی سیاست ابھی زیادہ روشنی حاصل نہ کر پائی تھی کہ اقبال کا بلاوا آ گیا اور وہ بیمار ہو گئے۔ ہر فرد کیلئے موت کا دن مقرر ہے مگر اقبال نے ایک مرد مومن کی طرح اس بلاوے کو خندہ پیشانی سے لبیک کہی۔ البتہ وہ موت سے بے نیازی کے عالم میں کچھ ایسے کھو جاتے تھے اور ایسی باتیں کرنے لگتے تھے جن سے یہ احساس

ہوتا تھا کہ ابھی موت ان سے برسوں دور رہے اور انہیں ابھی بڑے بڑے اہم کام انجام دینے ہیں۔ گرمی کے موسم کا آغاز تھا۔ اپریل کا مہینہ تھا کوئی گیارہ بجے کا وقت تھا۔ بہت سے دوست احباب جمع تھے میں بھی موجود تھا۔ ڈاکٹر صاحب مجھے چغتائی سے نہیں بلکہ میرے نام یعنی عبد الرحمٰن سے پکارتے تھے۔ فرمانے لگے عبدالرحمٰن میری آرزو ہے کہ میری کتاب جاوید نامہ مصور شائع ہوا اور اسے مغرب میں پھیلا دیا جائے۔ میں نے عرض کی۔ اس سے بڑھ کر میری اور کیا سعادت ہو سکتی ہے کہ میں آپ کی کتاب کو مصور کروں۔ میں بار بار یہ پیش کش کر چکا ہوں۔ انہوں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ گھبراؤ نہیں مجھے آرام ہولے میں خود اس کا انگریزی میں ترجمہ کروں۔ اوپر فارسی اور نیچے انگریزی ہونی چاہئے اور سامنے تمہاری تصویر دیکھنا اس کے کس قدر خوشگوار نتائج برآمد ہوں گے۔ دنیا دیکھے گی میں نے دعا کی کہ خدا آپ کو جلد شفا دے اور کلی اطمینان حاصل ہو میں آپکے اس کام کیلئے زندگی وقف کردوں گا اور جب تک آپ کی یہ آرزو پوری نہ ہوگی۔ دم نہیں لوں گا۔

اس کے بعد انہوں نے جاوید نامہ کے کئی ایسے مقامات کا ذکر کیا جن کیلئے وہ تصویریں چاہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ فرمایا کرتے تھے کہ عبدالرحمٰن فلاں نظم یا فلاں شعر تمہارے لئے ہے اس کی تصویریں بن سکتی ہیں۔ پھر کئی تصویروں کا میں نے ذکر کیا۔ جو وہ دیکھ چکے تھے اور فرماتے تھے یہ تصویر میرے شعر کی اور وہ تصویر میری یہ نظم کی ترجمان ہے مجھے خصوصیت سے 'شرف النساء' اور 'داستان گو' یاد ہیں۔

ان کی بڑھتی ہوئی بے کلی دیکھ کر لوگ اٹھتے جا رہے تھے۔ میں نے بھی رخصت چاہی تو ارشاد ہوا بیٹھے رہو میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بٹھا دیا۔ اتنے میں ان کی صاحبزادی منیرہ آ گئی۔ اس کو گود میں بیٹھنے کیلئے کہا اور فرمایا بیٹھ جاؤ ممکن ہے کل اس گود میں نہ بیٹھ سکو۔ مطلب یہ تھا کہ انہیں زیادہ سے زیادہ آرام کرنا ہوگا کیوں کہ ڈاکٹروں کی یہی ہدایت تھی جب میں دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا تو وہ منیرہ کی طرف دیکھ رہے تھے فرمانے لگے اچھا ہاتھ تو ملا لو۔ شاید پھر موقع نہ آئے۔ اس کے بعد بڑی محبت سے ہاتھ ملایا اور دیر تک ہاتھ میں ہاتھ لئے رہے۔

اسی رات وہ انتقال فرما گئے۔ ان کا جنازہ ان کی قیام گاہ سے اٹھا اور شہر کے اندر سے

ہوتا ہوا۔ شاہی مسجد تک پہنچا۔ اقبال کے آخری سفر میں ان کے ساتھ کون کون تھا۔ انگنت نام ہیں کس کس کا نام لکھوں۔ بڑے سے بڑا ہندو، سکھ مسلمان اور پھر وہ گدا گر بھی جو کبھی اقبال کے دروازے پر گیا تھا، لاہور کی فضا اس کے بازار گلی، کوچے سب سوگوار تھے جدھر سے جنازہ گزرتا تھا رونے کی آوازیں آرہی تھیں عورتیں ماتم کررہی تھیں۔ بوڑھے چیخ رہے تھے جوان بلک رہے تھے اور اقبال جس نے مسلمانوں کے دکھ درد کے وقت کبھی اپنی زبان کو نہ روکا تھا چپ تھا۔ جب اقبال کو قبر میں اتارا جارہا تھا تو اس کا چہرہ کفن سے باہر تھا اور مخلوق خدا تھی کی اُمڈی اور ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ لوگ آتے تھے، منہ دیکھتے تھے اور آنسو پونچھتے ہوئے پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ اس وقت میں آگے بڑھا اور میں نے اقبال کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ ایک دنیا معترض تھی مگر مجھے اس مردمومن کی پیشانی پر یکا یک ایک تجلی ایک روشنی نظر آئی تھی۔ اس بوسے کی لذت آج بھی میرے لبوں پر لرزاں ہے۔

(ماخوذ۔ فنون لاہور۔ سہ ماہی اشاعت خاص۔ اپریل 1963 زیرادارت احمد ندیم قاسی جہنب اشعر دہلوی)

☆☆☆

ڈاکٹر جیمز کزنز　　　　　　ترجمہ: رشیدہ ذکاء اللہ

چغتائی کا آرٹ

بعض حضرات کا وتیرہ ہوتا ہے کہ جب کسی نوعمر مصور کی تصویر دیکھتے ہیں تو ان دو چار چھپی ہوئی تصاویر کو جو کبھی ان کی نگاہ سے گزر چکی ہوتی ہیں۔ ذہن میں لا کر ایک مبصرانہ اور بیش و کم حقارت آمیز انداز سے فرماتے ہیں۔ ''اس مصور اور اس کی تصویروں پر جاپانی مصوری کا اثر ہے''۔ اہل فہم خوب جانتے ہیں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بالکل برعکس ''اتامارو'' کی خواتین ہندوستان کی ''شکتی'' کی اولاد ہیں ایسی اولاد جو جاپانی لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ جاپانی طریقے سے بال سنوارتی ہے اور جس کے اعضا میں جاپان کا طبعی سبک پن ہوتا ہے۔ اندریں حالات کیا یہ ہندوستانی آرٹسٹوں کا قصور ہے کہ جاپانی مصوری میں اور ان کی مصوری میں مشابہت ہے؟ اگر کسی کی صورت اپنے مورثِ اعلیٰ کی صورت سے ملے تو یہ مورثِ اعلیٰ کا قصور کیونکر ہو سکتا ہے؟

اسی قسم کے حضرات جب چغتائی کی تصاویر دیکھتے ہیں تو فرماتے ہیں ''چغتائی ایرانی مصوری سے متاثر ہے''۔ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ یہ کوئی عیب کی بات نہیں اور آخر چغتائی پر ایرانی اثر کیوں نہ ہو۔ چغتائی ایرانی النسل ہے۔ اس کا سلسلۂ نسب ان تاتاری مغلوں سے ملتا ہے جنہوں نے ایران کو اپنا مسکن بنایا اور جنہوں نے انجام کار موتی مسجد اور تاج محل جیسی رفیع الشان عمارتیں برپا کیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ چونکہ چغتائی ایرانی النسل ہے اس لئے اس کی مصوری میں ایرانی رنگ کی موجودگی لازمی ہے۔ سولہویں اور سترہویں صدی کے مغل آرٹ کے بعض ماہرین پکے ہندو تھے اور آج کل کے بعض ہندوستانی مصور جو غیر ملکی آرٹ کی نقالیاں کرتے ہیں ''پکے'' کچھ بھی نہیں۔ لیکن چغتائی! چغتائی کی بات بالکل مختلف ہے۔ اس کے دم سے ایرانی مصوری از سرِ نو زندہ ہوگئی ہے۔ اس مصوری میں اور اس مصوری میں فرق ہے تو صرف اتنا جو چغتائی کی عظیم شخصیت اور صدیوں کی آمدوشد کی وجہ سے لازمی تھا۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ چغتائی کے تصور میں آج بھی اکبر کے پُرشکوہ زمانے کا ہندوستان

بستا ہے۔ جہاں تک آرٹ کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں چغتائی کا یہ تصور ہمارے ہی لئے کارآمد ثابت ہوا ہے۔ اگر آج ہندوستان واقعی اکبر کے زمانے کا ہندوستان ہوتا تو یقینی طور پر چغتائی کوئی اور دنیا تخلیق کرتا اور یہ بات دعوے سے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ نئی دنیا بھی اسی قدر حسین ہوتی جیسی خوابوں کی یہ خوبصورت دنیا ہے جو چغتائی کے تخیل نے اب آباد کی ہے۔ یقینی بات صرف اس قدر ہے کہ وہ ایک نئی اور مختلف دنیا بناتا ضرور کیونکہ اس کا تعلق اس پراز رومان گروہ سے ہے جن کا کاروان ہمیشہ ساحل دوش یا کنار فردا پر خیمہ زن ہوتا ہے۔ اس گروہ کا ایک رکن انگریز شاعر کیٹس تھا۔ جو اپنے گرد و پیش کی دنیا سے بھاگ کر اپنے تخیل کی مخلوق یونانی دنیا میں پناہ گزیں ہوا تھا۔

بیرون ایشیا جو چیز چغتائی کے مداح پیدا کرتی ہے وہ اس کی تصاویر کا مشرقی تخیل ہے۔ اس کی تصاویر میں جو حیرت انگیز فنی کمال ہے وہ ہر صاحب فہم کا دل لبھاتا ہے لیکن ریلزم سے وہ بعد جو چغتائی نے ارادتاً اختیار کیا ہے۔ ان لوگوں کے لئے باعث تشکر ہے جو اس چیز سے جس کو مرئی حقیقت کہتے ہیں اکتا چکے ہیں اور تخیلی حقیقت کے متلاشی ہیں۔ اس تخیلی حقیقت کو واضح کرنا صدیوں سے مشرقی آرٹ کا مقصد اور مطمح نظر رہا ہے۔ اگر پرانے ایرانی شاہکاروں اور چغتائی کی تصویروں کو سامنے رکھ کر موازانہ و مقابلہ کیا جائے تو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ ان میں یگانگت کس حد تک ہے اور کس حد تک چغتائی نے اس جوش طبیعت سے جو ایک ایسے خلاق آرٹسٹ کا نشان امتیاز ہوتا ہے جو اپنی روایات سے کما حقہ، آگاہ ہو۔ اپنا ذاتی کمال ایزاد کیا ہے۔ قدیم ایرانی شاہکاروں میں اور چغتائی کی تصاویر میں تغزل اور ایک نازک۔ پرسکوت توازن مشترک ہیں۔ لیکن رنگوں کا خوبصورت امتزاج۔ خطوط کی ہم آہنگی جس کی بدولت خطوط تصویر کے خطوط نہیں رہتے بلکہ ان شاعرانہ جذبات کے جو الفاظ کی گرانباری کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ نقوش بن کر نگاہوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ لباس کی تزئین و ترتیب جس کا مقصد محض انسانی جسم کو مستور یا عریاں کرنا نہیں ہوتا بلکہ جو بجائے خود ایک جمالیاتی کارنامہ ہے اور ساسانی عمارات کا پس منظر جو انسانی تخیل کو اس دنیا سے دور رومان اور حسن کی دنیا میں لے جاتی ہے۔ تمام صفات چغتائی کی خصوصیت ہیں اور اس کی تصاویر میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

(''اسٹوڈیو۔لندن''۔ ماخوذ: سالنامہ کاروان ۱۹۳۴ء۔لاہور)

☆☆☆

علامہ اقبالؔ

دیباچہ مرقع چغتائی

جناب محمد عبدالرحمٰن صاحب چغتائی نے دیوان غالب کا ایک مصور مرقع (ایڈیشن) شائع کیا ہے میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ ہندوستان کی جدید مصوری اور طباعت میں یہ ایک نادر کارنامہ ہے بدقسمتی سے میں اس موقع پر فنی انتقاد کا اہل نہیں ہوں۔ ناظرین سے ڈاکٹر کزنؔ کے گراں قدر دیباچہ کے مطالعہ کی سفارش کرتا ہوں انہوں نے ان اہم محرکات کا تجزیہ کیا ہے جو چغتائیؔ صاحب کے فنی نصب العین کی تشکیل پر اثر انداز ہیں۔

مجھے جو کچھ کہنا ہے اس کا حاصل بس اسی قدر ہے کہ میں سارے فنون لطیفہ کو زندگی اور خودی کے تابع سمجھتا ہوں۔ عرصہ ہوا میں نے اس باب میں اپنے نقطہ نظر کا اظہار ۱۹۱۴ء میں اپنی مثنوی اسرار خودی میں کیا تھا۔ اس کے تقریباً بارہ سال بعد زبورعجم کی آخری نظم میں بھی اسی زاویۂ نگاہ کی ترجمانی کی ہے۔ میں نے اس نظم میں ایک ایسے صاحبِ فن کی معنوی تحریک کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے اندر محبت جلال اور جمال کی جامعیت کی صورت میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔

دلبری بے قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

اس نقطۂ نظر سے جناب چغتائی کی بعض جدید تصویریں نمایاں امتیاز کی حامل ہیں کسی قوم کی معنویت صحت زیادہ تر اس روح کی نوعیت پر منحصر ہے جو اس کے اندر اس کے شعراء اور صاحبان فن پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اس روح کی نوعیت کا سوال محض ان کے شخصی ذوقِ انتخاب پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ یہ ایک وہبی عطیہ ہے۔ جس کی نوعیت کا فیصلہ خود اس عطیہ کا حامل بھی حصول سے پہلے نہیں کرسکتا۔ یہ فیض فرد کو بے طلب حاصل ہوتا ہے تاکہ اسے وہ وقف عام کرے۔ اسی اعتبار سے اس معنوی روح کی حیات بخش قوت اور اس کی حامل شخصیت، نوع انسانی کے لئے

نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ کسی اہل ہنر کا مائل بہ انحطاط ضمیر، اور تصور ایک قوم کے لئے اٹیلا اور چنگیز کے لشکروں سے زیادہ تباہ کن ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کی تصویریں یا اس کے نغمے جذب و کشش کی طاقت بھی رکھتے ہوں۔

جیسا کہ پیغمبر اسلام نے قبل از اسلام عہد کے عربی شاعر اعظم ...... امراء القیس، کی بابت فرمایا: اشعر الشعرا وقائد هم الی النار۔

''وہ افضل ترین شعراء سے ہے اور دوزخ کی طرف لیجانے میں ان کا امام ہے۔''

مشہود کو غیر مشہود کی تشکیل کی اجازت اور اس صورت حال کی طلب جس کو علمی اصطلاح میں فطرت کے ساتھ توافق کہا جاتا ہے۔ دراصل روح انسانی پر طبیعی ماحول کے تسلط و تسخیر کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ طاقت طبیعی ماحول کے مقابلہ سے پیدا ہوتی ہے نہ کہ اس کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے ''جو چاہئے'' (معیاری نصب العین) کی نمود کی خاطر 'جو ہے' کا مقابلہ ہی صحت اور قوت کا سرچشمہ ہے۔ اس کے ماسوا انحطاط اور موت ہے۔ خدا اور انسان دونوں کا تسلسل حیات متواتر تخلیق سے وابستہ ہے۔

حسن را از خود برون جستن خطاست
انچہ می بایست پیش ماکجاست

جو اہل ہنر، نوع انسان کے لئے رحمت ثابت ہوتے ہیں ان کا ربط اپنے ماحول حیات کے ساتھ ''بازمانہ ستیز کا ہوتا ہے۔'' ایسا بلند مرتبت ہنرور صبغۃ اللہ (الٰہی رنگ) میں ڈوبا ہوا ہے۔ اپنی روح میں وہ زمان کی حقیقت اور ابدیت کو محسوس کرتا ہے۔ بقول فشٹے اسے فطرت نہایت عمیق، وسیع، کامل دکھائی دیتی ہے۔ برخلاف اس شخص کے جس کی نگاہ میں اشیاء نفس الامری سے نا تمام ضعیف تر اور ناقص تر دکھائی دیتی ہیں دور حاضر فطرت (طبعی ماحول) ہی کو سرچشمہ فیضان قرار دیتا ہے۔ لیکن یہ فطرت تو صرف ''ہے'' سے زیادہ کچھ نہیں اور اس کا منصب ''چاہئے'' کے لئے ہماری جستجو کا حجاب بنتا ہے۔ صاحب ہنر کو اس کا شعور اپنے ہی نفس کی گہرائیوں میں حاصل کرنا چاہئے۔

جہاں تک اسلام کی تہذیبی تاریخ کا تعلق ہے۔ میرا اپنا عقیدہ یہ ہے کہ سوائے فن تعمیر کے استثناء کے اسلامی فنون لطیفہ، موسیقی، مصوری بلکہ کسی حد تک شاعری بھی ہنوز ظہور کے طالب

ہیں۔وہ فن، وہ ہنر جس کا مطمح نظر اخلاق الٰہی کو اپنے اندر جذب کرنا (تخلقوا باخلاق اللّٰہ) ہے، دراصل انسان کے اندر ایک غیر محدود طلب (اجر غیر ممنون) پیدا کرتا ہے اور انجام کار اسے اس زمین پر اللہ کی خلافت کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

مقامِ آدمِ خاکی نہاد، دریا بند
مسافرانِ حرم را خدا دہد توفیق

اس امر کے آثار نمایاں ہیں کہ پنجاب کا یہ نوجوان اہل ہنر اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھتا ہے۔خیر سے ابھی تو وہ زندگی کی انتیسویں منزل طے کر رہا ہے مستقبل ہی اس کا جواب دے گا کہ چالیس برس کی پختہ عمر میں اس کا کمال کیا رنگ اختیار کرے گا، اور کس درجہ پر فائز ہو گا۔اس عرصہ میں اس کے ہنر سے دلچسپی رکھنے والے سارے اہل نظر اس کی ترقی کے منازل پر اپنی نظریں جمائے رہیں گے۔

ترجمہ۔از ڈاکٹر غلام دستگیر رشید۔''مضامین اقبال'' مرتبہ تصدق حسین تاج مطبوعہ ۱۹۴۳ء سے ماخوذ)

☆☆☆

خبر نامہ

۱۔ قراردادِ تعزیت

حیدر آباد کی ہر دلعزیز شخصیت ڈاکٹر سید عبد المنان کا سانحۂ ارتحال

ڈاکٹر سید عبد المنان کے سانحۂ ارتحال پر اقبال اکیڈیمی اور اسلامک ہیریٹیج فاؤنڈیشن (IHF) کا ایک مشترکہ ہنگامی اجلاس جناب ظہیر الدین صاحب صدر اقبال اکیڈیمی و معتمد اسلامک ہیریٹیج فاؤنڈیشن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں جناب محمد ضیاء الدین نیر نائب صدر اقبال اکیڈیمی ،معتمد جناب سید امتیاز الدین ، جناب محمد عمر علی خان کارگذار صدر (IHF) جناب سید محمود قادری اور دیگر رفقاء نے شرکت کی ۔اس موقع پر جناب محمد ضیاء الدین نیر نے ایک قرارداد تعزیت پیش کی ۔ اس قرارداد تعزیت میں رنج والم کا اظہار کرتے ہوئے کہا گیا کہ ''ڈاکٹر سید عبد المنان کی رحلت ہمارے لئے ایک عظیم سانحہ ہے۔ ہمارا شہر حیدر آباد ایک نامور حاذق طبیب سے محروم ہوگیا۔ وہ سراپا اُردو تہذیب کا نمائندہ تھے۔ان کی شخصیت سادگی، شرافت وشائستگی اور انکسار و تواضع کا نمونہ تھی ۔ ان کے انتقال سے اخلاقیات کی دنیا میں ایک خلاء پیدا ہوگیا اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کی دلآویز شخصیت کو ہم عرصہ تک بھلا نہ سکیں گے ۔ڈاکٹر صاحب مرحوم ہمیشہ اقبال اکیڈیمی اور اسلامک ہیریٹیج فاؤنڈیشن کی سرگرمیوں کو فروغ دینے کیلئے دلچسپی لیتے رہے۔ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت النعیم میں جگہ عطا فرمائے ۔اور جمیع پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے ۔آمین ۔

۲۔ڈاکٹر سید عبدالمنان کا سانحۂ ارتحال۔جلسۂ تعزیت

ڈاکٹر سید عبدالمنان کی یاد میں اقبال اکیڈیمی اور اسلامک ہیرٹیج فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ایک تعزیتی جلسہ گلشن خلیل مانصاحب ٹینک میں محمد ظہیرالدین صاحب صدر اقبال اکیڈیمی کے زیرنگرانی منعقد ہوا۔جلسے کی ابتداء قاری محمد سلیمان صاحب کی قرأت سے ہوئی۔جلسے کے آغاز میں سید امتیاز الدین صاحب نے ڈاکٹر سید عبدالمنان اور شاذ تمکنت صاحب کے باہمی خلوص کا ذکر کیا۔امتیاز صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب اہلِ حیدرآباد کیلئے فطرت کی نعمتوں کی طرح نہایت ضروری اور بے حدارزاں تھے جیسے ہوا، پانی اور روشنی۔جتنے دن گذریں گے ہمیں ان کی جدائی کا احساس اور زیادہ ہوگا۔جناب سجاد شاہد صاحب نے منان صاحب سے اپنے خاندانی مراسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر صاحب زندگی کے آخری دن تک پریکٹس کرتے رہے اوران کے پاس اتنے مریض آتے تھے کہ بیٹھنے کے لئے جگہ نہیں ملتی تھی۔متوسط آمدنی والے مریضوں کا بھی ڈاکٹر صاحب خاص خیال رکھتے تھے۔عبدالرحیم خان صاحب نے انجمن ترقی اردو کی نمائندگی کرتے ہوئے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب نے انوار العلوم کالج کی خدمت کی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ان کا دوراس کالج کا سنہرا دور تھا۔شاہد علی عباسی صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے اپنی دیرینہ عقیدت کا اظہار کیا۔انہوں نے کہا کہ وہ پیدائش سے لے کرآج تک ڈاکٹر صاحب کے زیر علاج رہے ہیں۔عباسی صاحب نے کہا کہ ان کے خاندان کی چار نسلیں ڈاکٹر صاحب کی مسیحائی سے فیض یاب ہوئیں۔

حبیب علاء الدین صاحب صدر علاء الدین ٹرسٹ نے ڈاکٹر صاحب کو انگریزی میں بھرپور خراج عقیدت پیش کیا اور ان کے نقصان کو ناقابلِ تلافی قرار دیا۔ممتاز مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین نے کہا کہ حیدرآباد کی تہذیبی زندگی کیلئے ایک بنیاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ان کے مزاج میں خوش دلی تھی۔مجتبیٰ حسین نے کہا کہ جب انہوں نے مزاح نگاری شروع کی تو ڈاکٹر صاحب ان کے اولین سرپرستوں اور مداحوں میں سے ایک تھے۔عمر علی خان صاحب کارگذار

صدر اسلامک ہیریٹیج فاؤنڈیشن نے بتایا کہ جب 1950ء میں ڈاکٹر صاحب ولایت سے واپس ہوئے تو حیدرآباد کے حالات سے بہت متاثر ہوئے ۔ وہ اضلاع سے آنے والے مریضوں کا بہت خیال کرتے تھے ۔ بارکس کے ایک بزرگ کی آواز ابھی حال میں بہت متاثر ہوگئی تھی ۔ وہ مایوس العلاج ہوگئے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب کے علاج سے وہ صحت یاب ہوگئے ۔ ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں، جنہیں ڈاکٹر صاحب کے دستِ شفاء پر نئی زندگی ملی ۔

عبدالرحیم قریشی صاحب صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے پیشے کو خدمتِ خلق کیلئے استعمال کیا ۔ وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے بانی اراکین میں سے تھے ۔ قرآن وسیرت سوسائٹی کے قیام میں ڈاکٹر صاحب کی کوششیں شامل تھیں ۔ مناظر احسن گیلانی کی تفسیر سورۂ کہف سوسائٹی کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی ۔ جناب قاسم رضا نے بھی قرآن وسیرت سوسائٹی سے ڈاکٹر صاحب کی خصوصی دلچسپی کا ذکر کیا ۔

صدر جلسہ محمد ظہیر الدین صاحب نے فرمایا کہ آج ہر مقرر نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے ۔ انہوں نے تجویز رکھی کہ ڈاکٹر صاحب کے بکھرے ہوئے مضامین کو یکجا کر کے شائع کیا جانا چاہئے ۔ اس سلسلے میں انہوں نے متعلقہ اصحاب سے تعاون کی اپیل کی ۔ انہوں نے کہا کہ مرحوم کے چاہنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ کچھ ایسے اقدامات کریں کہ ان کے چھوڑے ہوئے کام جاری رہیں ۔ اس جلسے میں ڈاکٹر سید عبدالمنان سے محبت رکھنے والوں کی کثیر تعداد شریک تھی ۔ ڈاکٹر صاحب کے دونوں فرزندان فیض منان اور سید محمد حیدر اور ان کے قریبی عزیز بھی جلسے میں شریک تھے ۔ دعائے مغفرت پر جلسہ تعزیت کی برخاستگی عمل میں آئی ۔

☆☆☆☆

۳۔ کتب خانہ اقبال اکیڈمی

پچھلے 6 ماہ کے عرصہ میں اقبال اکیڈمی کے کتب خانہ کیلئے حسب ذیل اداروں اور ہمدردوں نے کتب اور رسائل عنایت فرمائیں۔ ادارہ ان اداروں اور معاونین کا ممنون ہے۔

۱۔ اسمائے گرامی	تعداد کتب/رسائل
۱۔ اقبال اکیڈمی پاکستان	۱۔ اقبال ریویو انگریزی۔ (2) اقبالیات (اردو) (2) ۳۔ پاکستان میں اقبالیاتی ادب (1) ۴۔ انداز محرمانہ۔ خرم علی شفیق (1) ۵۔ علامہ اقبال اور بلوچستان (1) ۶۔ اقبال تشکیلی دور (۱۹۰۵۔۱۹۱۳) (سوانحی ادب میں ایک اہم کتاب از خرم علی شفیق) ۷۔ The Western Horizan By G .R. malik(1) ۸۔ مشعلِ راہ مستقیم۔ از برکت اللہ بھٹی (1). ۹۔ انسائیکلو پیڈیا قرآنیات ۵ جلدیں Beyond the Manifroz by D. S. Qaisar(1)
۲۔ مرکز تحقیقات فارسی پاکستان۔	مجلہ دانش (۱)
۳۔ جناب خواجہ اعجاز بٹ۔	(۱) اقبال اور مرے کالج (شاعری) ۲۔ بنیادیں۔
۴۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور)	۱۔ جامعات میں اردو تحقیق ۲۔ مکاتیب رشید احمد خان
۵۔ پروفیسر ساحل احمد صاحب۔	خیر خواہانِ جہاں علم و زبان۔ ۵ جلدیں (اہم سوانحی ادب)

۶۔ ڈاکٹر محمد عظیم الدین بخش	(متوسط جناب اسد ثنائی) یادوں کے دریچے سفر نامہ (۱)
۷۔ پروفیسر بی شیخ علی (بنگلور)	معرفت جناب سید احمد ایثار۔ جاوید نامہ (انگریزی میں نثری ترجمہ (۱)
۹۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر	Muslim World Almanec 2008(1)
۱۰۔ جناب سید امتیاز الدین	کلیات عوض سعید (دو جلدیں) اور دیگر کتب (۶)
۱۱۔ جناب محمد عبدالقادر (امریکہ)	فوائد الفواد ملفوظات خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور دیگر کتب
۱۲۔ جناب مظہر لطیفی صاحب	طبقات ابن سعد (۸ جلدیں) بات کہی کبھی کبھی۔از حامد لطیف ملتانی
۱۳۔ جناب محمد عبدالرحیم قریشی	قرآن مجید اصلاح معاشرہ کی کلید (انگریزی واردو۔مولفہ ڈاکٹر سیدہ لطیف النساء بیگم۔
دیگر معاونین	(۱۴) جناب قدیر زماں (۱۵) جناب علیم خان فلکی (۱۶) جناب محبوب فرید۔ (۱۷) محمد راشد علی (جواد) امریکہ، انگریزی میں دو کتابیں۔

اکیڈیمی ان تمام اداروں اور معاونین کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

IQBAL REVIEW

NOVEMBER 2009

English Section

"Baaqiyaat-e-Iqbal" New Tasks for Iqbal Academy

By: Hameeduddin Mahmood

By: Hameeduddin Mahmood

"Baaqiyaat-e-Iqbal" New Tasks for Iqbal Academy

Introduction

Mr.Hameeduddin was an outstanding scholar ,with deep insight in socio-economic and cultural problems.He left an indelible/ impact on the intellectual circles of Hyderabad and Delhi.Deeply intrested in fine arts,he could brilliantly analyse,any piece of art with great depth.As he had an encyclopaedic vision,he could evacuate dispassionate by the problems incounting society.

He wrote in English with great ease and he lived Urdu passionately. He had a deep understanding of the aesthetics of its poetry.Mir,Ghalib,Iqbal were at his bed side.

He rated Iqbal as the most outstanding poet of his age and feel Iqbal could transform the society totally.

His vision of Iqbal is that of a revolutionary who could be a great source of inspiration for entire Muslim World and humanity at large.

In 1993 during his stay in Hyderabad he discussed with me about various proposals to dissimonate the message of Iqbal. Iqbal Academy had already taken a few steps of implement his suggestions.

However a lot of work is yet to be done.

The prismatic genius of Iqbal and the kaleidoscopic variety of his work would impel and inspire constant discoveries of his multidimensional personality. It should not to presumed that Iqbaaliyaat, the discipline of study of Iqbal, would exhaust its entire potential. I am however aware of confining Iqbaliyaat to the realm of the printed word, as also to traditional seminarism about Iqbal.

Sometime back Mr Md Zaheeruddin Ahmed, president of Iqbal Academy Shared with me his plan to compile an anthology of Iqbal's poems for children. I think it is a very useful idea deserving immediate realisation.

There are also several Transdisciplinary ways in which Iqbal can be approached, appreciated interpreted and analysed. My interest is in presenting Iqbal in unorthodox ways and through various forms of mass communication. I am becoming apprehensive about today's youth understanding Iqbal because of not having adequate vocabulary in Urdu. Also because of Indian languages, other than Urdu, entering a new phase of growth, it seems necessary to transfer Iqbal in these languages. Iqbal must not remain unfamiliar to the new generation in these languages.

Possessed by these obsessions, I have thought up same ideas which are both short-term and long-term. Some are possible to realise soon and others would require dedicated work over long periods. Some would involve small expenditure while others would need heavy investment. Some may generate revenue and others may be frustratingly non - profitable. The academy may have to think in terms of raising required resources.

Iqbal through performing arts

1.annual competition of suited to musicalisation. AIR Jaipur has a musical rendering of Iqbal's "Himala" and it is

a very impressive rendering. The academy can hold annual competition of singing Iqbal's songs in three styles of music: Hindustani Sangeet, Carnic, Sangeet, for the last category Iqbal's humorous poems (that are happily short) can be chosen. The details as to how many awards and how much the award money may be decided by the Academy. Business houses can also be interested in sponsoring such a competition. In order to have a common base, one poem for each category may be fixed for the participants to render in their own different ways. This is better than leaving the choice of poem to the participants.

The prize winning rendering can be issued in the form of audio cassettes, filling in the remaining portion of the tape with other musical compositions of Iqbal's poems. These however should be in Hindustani tradition and in light classical style. Some may go into movies or relay-serials.

2.video programmes of operatic renditions of Iqbal's poems

some of Iqbal's episodic poems, such as "Roh-e-urzi Aadm ka Istaqbal karti hai" , can be done as operas. These can be offered to TV stations in India and abroad. Like the audio cassettes above, the video cassettes too would earn revenue.

3.commissioned musicalisation of outstanding Iqbal poems

some poems of Iqbal require a very high level of musical composition which, in my opinion, only Naushad Salil Chaudhry or Anil Biswas can do. The one poem in my mind is "Azaan".

In the case of S.No.2 and 3, I am prepared to write down the musical concept and also direct the production, with my credit and payment assured.

II. Iqbal through visual media.

3. Animation strips of Iqbal's poems for children for syndication several of Iqbal's poems for children and also some other episode poems can be rendered into animated strips for serialized reproduction in Urdu ad Hindi newspapers. By syndicating them, we can recover part of the cost in producing them.

4.annual painting competition each year, one couplet Iqbal can be given for rendering it through painting. The competition should be open to amateurs only. Albums of award winning and other good works can be brought out as albums. Tourist hotels may also be offered to buy these.

III. Iqbal through performing arts:

5.stage plays in prose can be written taking their substance form Iqbal's poems. In staging these plays, first the poem should be rendered, if possible musically, and then the play should be presented. This too can be made into an annual competition for college teams. Outstanding plays can be published in book form.

6.Iqbaliyaati Baitabaazi

The art of Baitabaazi can be revived using Iqbal's poetry. This schuld be in the form of competition between school teams.

7. Iqbal quiz

cashing in on the quiz craze, an Iqbal quiz can be organized as an annual competition for students, and also for elders. this too can be transferred to tapes (audio) for school or community use.

8. Annual Iqbal Festival

the above seven programmers can be designed as part of an Iqbal festival, supplementing it with seminars and discussions etc. the admission may be charged.

IV. Iqbal through print medium

9. Revised edition of "Kuliyaat"

I find many words of Iqbal unfamiliar an

incomprehensible. It is likely the it may be more so with today's generation of Urdu seekers. I propose a new edition of "Kuliyaat", which should give meanings of words on the same page where the word ocure in a poem. It should also give short notes on the particular person, place or event refered to by Iqbal. This will greatly facilitate a common man response to Iqbal. This revised edition should give page numbers in running serial, not book wise as has been done until now. The word should be given in Naskh and meanings of words and notes on reference should be entered for the facility of teachers and students alike.

11.chronology of Iqbal's life

a small booklet, on the lines of the facts file I had appended to my article on "End-of- te century perspectives on Iqbal I the contest of current and developing global trends, should be brought out or general use and research purposes.

12.chronology of Iqbal's poems

for the facility of researchers and general readers as well, a chronology of Iqbal's poemsshuld be produced in the from of a small booklet.

13. Special articles

I feel an immediate need of commissioning three articles:

a. "iqbal's trakeeb" (over 20,000 word formations in 10,000 couplet in 560 poems) these should be interpretative and analytical.

2. "Iqbal as translator of English poems." This should be done to

promote the art and technique of translating foreign and other Indian language poems into urdu.

3. Three persons, three spaces and three times: a comparative study of Ibn-e-Khaldum, spinoza and Iqbal."

It should be a work of the kind Dr. Raziuddin Siddiqui did in relation to the concept of time, in the Philosophy of Einstein and Iqbal.

14. Preparing Indian language versions of Iqbal's poetry

in my view this task deserves utmost priority, if Iqbal were no to be called a foreign poet. We ca proceed gradually, language by language. For this purpose, th academy will have t employ on regular and permanent basis bilingual scholars who should devote their lifetime to translating the entire Urdu Kalaam of Iqbal. This work is obviously for publication.

Each year, at least 100 poems must be rendered into a language. Each translation should be assessed meticulously before it is okayed for print.

After all poems have been translated, these scholars should be entrusted with the task of translation books on Iqbal.

This work needs great financial investment. Funds should be found. If this is done we would fulfill Iqbal's desire and plea to diffuse his poetry among the people.

To end time has come to take Iqbal seriously, and not merely as a topic or mental wrestling.

☆☆☆

Vol: 18 Issue:2
November 2009

ISBN No: 81-86370-45-5

(JOURNAL OF THE IQBAL ACADEMY HYDERABAD)

NOVEMBER 2009

"IQBAL REVIEW"

IQBAL ACADEMY

Gulshan-e-Khaleel, Masab Tank, Hyderabad-28, A.P., INDIA